یادگارِ غالب

(حصہ فارسی)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

یادگارِ غالب

یادگارِ غالب

(حصہ فارسی)

خواجہ الطاف حسین حالی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

Yadgar-e-Ghalib
by
Khwaja Altaf Husain Hali
Rs.112/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2011 تعداد: 1100 قیمت:-/112 روپے
ISBN:978-81-7587-681-1 سلسلۂ مطبوعات:1564

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025
فون نمبر:49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرز، C-7/5، لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنّفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلبا کے لیے ''درسی کتب'' اور ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلّی، ممبئ اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعّال ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطّل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شاملِ حال رہے گا۔

خالد محمود

مینجنگ ڈائرکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

فہرست مضامین

نثر فارسی

انتخاب از مکاتبات ۴۰۴

نظم و نثر فارسی

فارسی لٹریچر میں ایشیائی مذاق کے موافق جو دستگاہ مرزا نے بہم پہنچائی تھی اور فارسی نظم اور فارسی نثر دونوں میں جو بلند پایہ انھوں نے حاصل کیا تھا، اُس کو اِس زمانے میں کما حقہٗ لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے، جب کہ اس زمانے میں بہت سخن سنج اور نکتہ پرور موجود تھے، مرزا ہمیشہ زمانے کی ناقدری کی شکایت کرتے تھے، تو اب کیا امید ہو سکتی ہے کہ لوگوں کو ان کی قدر جتائی جا سکے۔ ہم سے اگر کچھ ہو سکتا ہے، تو صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ ان کے ہر قسم کے کلام میں سے کچھ کچھ بطور نمونہ کے پبلک کے سامنے پیش کر دیں، اور چوں کہ فارسی زبان سے ملک میں عموماً اجنبیت ہو گئی ہے، اس لیے جہاں ضرورت دیکھیں مرزا کے کلام کی شرح بھی کرتے جائیں۔ اس سے شاید یہ فائدہ ہو کہ مرزا کی قوتِ متخیلہ میں جو غیر معمولی اُپج اور پرواز قدرت نے ودیعت کی تھی، سمجھ دار آدمی اس کا کسی قدر اندازہ کر سکیں، لیکن زبان اور بیان کی خوبی جو ایک وجدانی چیز ہے اور جس کے نقّاد اور جوہری ملک میں کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ اس کی نسبت صرف مرزا کا یہ فصیح و بلیغ شعر لکھ دینا کافی معلوم ہوتا ہے:

غریبِ شہر سخن ہاے گفتنی دارد بیاورید، گر اینجا بود زباں دانے

البتہ ایک مختصر گُر مرزا کے متعلق یہاں بتا دینا ضرور ہے، جو ان کا کلام دیکھتے وقت یاد رکھنا چاہیے۔ اگرچہ مرزا کو فارسی زبان میں (خواہ نظم ہو،

خواہ نثر، ہر قسم کے مضامین بیان کرنے پر ایسی ہی قدرت حاصل تھی، جیسی کہ ایران کے ایک بڑے سے بڑے مشّاق و ماہر و مسلّم الثبوت استاد کو ہونی چاہیے، لیکن جس طرح تمام ممتاز اور نامور شعراء میں خاص خاص مضامین کے ساتھ زیادہ مناسبت دیکھی گئی ہے، اسی طرح مرزا بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہ تھے۔ تصوّف، حُبِّ اہلبیت، فخر، شوخی و ظرافت، رندی و بے باکی، بیانِ رنج و مصیبت و شکایت وزارنالی، اظہارِ محبت و ہمدردی، حسنِ طلب ــــ یہ چند میدان ایسے تھے، جن کا بیان مرزا کے تمام اصنافِ سخن میں اکثر نہایت لطیف و ملیح و مرقص واقع ہوا ہے۔ بے شک یہ بات ان کے عشقیہ مضامین و اخلاق و موعظت کے بیان میں عام طور پر نہیں پائی جاتی کیوں کہ عشق و محبت اور تمام تعلقات و معاملات عاشق و معشوق کا بیان، جیسا کہ ظاہر ہے، محض نیچرل سادگی اور بے تکلفی چاہتا ہے اور شاعرانہ صنعت سے جس کو مرزا نے جا بجا شاعری کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اِبا کرتا ہے۔ برخلاف اس کے مرزا اصنافِ کلام میں اپنی مصطلح شاعری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے (الّا ما شاء اللہ)، اسی لیے ان کے عاشقانہ اشعار میں باوجود کمال جزالت اور متانت کے وہ گرمی اور تاثیر جو شعر کی جان اور غزل کا ایمان ہے، عام طور پر نہیں پائی جاتی۔ اخلاق و موعظت کا بیان بھی اسی لیے موثر اور دل آویز نہیں ہے کہ وہ جب تک نہایت سادہ اور صاف اور شاعرانہ تکلفات سے پاک نہ ہو، دلوں میں گھر نہیں کر سکتا، مگر اس سے مرزا کی استادی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ جب سعدی کی رزم کی نسبت کہا جاتا تھا کہ "ایں شیوہ ختم است بر دیگراں" اور اس کا قصیدہ بھی بہت پست سمجھا جاتا تھا، اور باایں ہمہ سعدی کی استادی کو سب نے تسلیم کیا، تو مرزا کے خاص قسم کے بیانات کی نسبت ایسا کہنے سے ان کی اُستادی میں کیوں کر فرق آسکتا ہے! یہ میزان جو ہم نے

مرزا کے کلام کی نسبت بتائی ہے، اس کو ان کے کلیاتِ نظم و نثر میں جانچنا چاہیے، نہ انتخابی اشعار میں، جو اس کتاب میں درج کیے گئے ہیں۔

مرزا کی فارسی شاعری اور فارسی انشا پردازی کے متعلق یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے پچاس برس تک مرزا کو ایک ایسے فن کی تکمیل اور اس میں ترقی کرنے پر مستعد و سرگرم رکھا، جس کا زمانے میں کوئی قدر دان نہ تھا۔ ان کے ممدوح زیادہ تر انگلش گورنمنٹ کے ارکان و اعیان تھے جو فارسی زبان اور خاص کر فارسی شاعری سے محض اجنبی تھے، یا بادشاہ اور سلاطین و امرا و رؤسا تھے، جن کو مرزا کے فارسی قصیدے پڑھنے اور سمجھنے کی نہ فرصت تھی، نہ ضرورت۔ وہ شخص جس کا قصیدہ انوری و خاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھائے، جس کی غزل عرفی و طالب کی غزل سے سبقت لے جائے، جو رباعی میں عمرِ خیام کی آواز میں آواز ملائے اور جس کی نثر کے آگے ابو الفضل اور ظہوری کی نثریں پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوں، اس کو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپیہ ماہوار ملتا تھا، اور وہ بھی چھ سات برس سے زیادہ نہیں ملا۔ گورنمنٹ کے ارکان و اعیان کی مدح کے صلہ میں مرزا کو اس خلعت کے سوا کبھی کچھ نہیں مرحمت ہوا، جو فوراً فروخت ہو کر سرکاری چپراسیوں کے انعام میں صرف ہو جاتا تھا۔

مرزا کے ماننے والے اور ان کے فارسی کلام پر ایمان بالغیب رکھنے والے بلاشبہہ ملک میں بے شمار تھے، مگر ایسے خوش اعتقادوں کی کثرت اور ان کی تحسین و آفرین سے شاعر کا دل ہرگز نہیں بڑھ سکتا۔ پس جب کہ ممدوحوں کی قدر دانی کا وہ حال ہو، اور مادحین کی مدح سرائی کا یہ رنگ، تو پھر وہ کیا چیز تھی جس کو مرزا کی اصلی اور حقیقی ترقی کا باعث قرار دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ شاعر کے دل میں اصلی ترقی کا ولولہ، نہ سلاطین و امرا کی داد و دہش سے پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ

خوش اعتقاد شاگردوں اور ماننے والوں کی کثرت سے؛ بلکہ اس کا دل بڑھانے والی صرف دو چیزیں ہیں، جو خواہی نخواہی اس کو ترقی کرنے پر مجبور کرتی ہیں؛ اولاً سبق استعداد اور فطری قابلیت جس کا اقتضایہ ہے کہ اگر تمام عالم میں ایک قدر دان یا مخاطبِ صحیح نہ ہو، تو بھی وہ اپنے جوہر ظاہر کیے بغیر نہیں رہتی جس طرح مور خواہ ویرانے میں ہو اور خواہ آبادی میں، اس کو مستی اور نشاط کے عالم میں ناچنے سے گریز نہیں، اسی طرح وہ شاعر، جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہی پیدا ہوا ہے، بغیر اس کے کہ ملک میں کوئی اس کی قدر کرے، یا اس کے کمال کی داد دے، اپنے ہنر کی تکمیل میں ہاتھ پاؤں مارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دوسرے، اُس فطری ملکہ کا تحریک دینے والا اور اس آگ کا پتھر سے نکالنے والا اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ سوسائٹی میں کچھ لوگ فی الحقیقت سخن فہم و سخن سنج موجود ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹما رہا تھا اور فارسی شاعری کی عمرِ طبیعی اختتام کے قریب پہنچ گئی تھی، مگر حسنِ اتفاق سے اس اخیر دور میں چند صاحبانِ فضل و کمال خاص دار الخلافہ دہلی میں ایسے پیدا ہو گئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے۔ ان چند صاحبوں سے میری مراد مولانا فضل حق خیر آبادی ثم الدہلوی، مولانا مفتی محمد صدر الدین خاں متخلص بہ آزردہ، مولوی عبداللہ خاں علوی، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، نواب مصطفےٰ خاں حسرتی، نواب ضیاالدین احمد خاں نیر، سید غلام علی خاں وحشت وغیرہم ہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کا مرزا کے عصر میں موجود ہونا اُن کی شاعری کے حق میں بعینہ ایسا تھا، جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خانخاناں، ابوالفتح، فیضی اور ابوالفضل کا ان کے زمانے میں ہونا۔

اگرچہ ان بزرگواروں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے، جو ظاہرا مرزا کی شاعری

کو تسلیم نہیں کرتے تھے؛ لیکن چوں کہ یہ سب لوگ سخن فہم اور سخن سنج تھے، اس لیے جس طرح قدر دانوں کی تحسین و آفرین سے مرزا کا دل بڑھتا تھا، اسی طرح نکتہ چینوں کے خیال سے ان کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا، اور ان کے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لیے اظہارِ کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی، اور اس طرح قدر دان اور نکتہ چین دونوں ان کی ترقی کا باعث تھے۔

لطیفہ مولانا فضل حق باایں ہمہ علم وفضل مرزا کو جس رتبے کا شاعر مانتے تھے، اس کا اندازہ حکایتِ ذیل سے ہو سکتا ہے:

مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جاکر پوچھے۔ اُنھوں نے کچھ معنی بیان کیے۔ اُس نے وہاں سے آکر مولانا سے کہا: "آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کیا کرتے ہیں، آج انھوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کیے۔" اور پھر وہ شعر پڑھا اور جو کچھ مرزا نے اُس کے معنی کہے تھے، بیان کیے۔ مولانا نے فرمایا: "پھر ان معنوں میں کیا برائی ہے؟" اس نے کہا: "برائی تو کچھ ہو یا نہ ہو، مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں ہے۔" مولانا نے کہا: "اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لیے، جو مرزا نے سمجھے ہیں، تو اس نے سخت غلطی کی۔"

مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے، اور وہ مقطع یہ ہے:

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری، غالبؔ! گر ترقی نہ کنم، شیخ علی را مانی

مومن خان مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سُنا، اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے؛ مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے۔

لطیفہ ایک صاحب نے جو مومن خان مرحوم کی تعلّیوں سے خوب واقف تھے،

یہ حکایت سُن کر کہا کہ مومن خان نے یہ اس لیے کہا کہ وہ اپنا رتبہ یقیناً شیخ علی حزیں سے برتر و بلند تر سمجھتے تھے، ورنہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے۔

نواب مصطفےٰ خان مرحوم ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم وغیرہ سے ان کو بمراتب برتر و بالا سمجھتے تھے۔ نواب ضیاء الدین خان کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترکِ لاچین (یعنی امیر خسرؔو) سے ہوئی اور ایک ترکِ ایبک (یعنی مرزا غالب) پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ سیّد غلام علی خان وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربیہ کی طرف متوجہ ہو جاتا، تو عربی شعر میں دوسرا متنبّی یا ابو تمام ہوتا اور اگر انگریزی زبان کی تکمیل کرتا، تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔

مولانا آزردہ بے شک مرزا کی طرزِ خاص کو جو انھوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی، ناپسند کرتے تھے؛ اور جو خیال کہ ابتدا میں مرزا کی نسبت مولانا کے خاطر نشین ہوگیا تھا، وہ اخیر تک ان کے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا۔ چناں چہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے، اُس میں اس مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے کہ مولانا ان کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قصیدے کی تمہید میں اپنے مصائب و آلام و شکایتِ روزگار وغیرہ کا بیان ہے، اس کے بعد مدح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں:

با چنیں اندہ کہ پُر گفتیم و دل خالی نشد	خواجہ گر اندہ گسارِ من نبودے، وائے من!
آنکہ در یکتائیِ وے در فنِ فرزانگی	متفق گردیدہ رائے بو علی با رائے من
آنکہ چوں خواہد نبامش نامہ نامی ساختن	بر نگارد عقلِ فعالش کرم فرمائے من"
دل بدیں و صفم نیاساید سخن کوتہ کنید	آنکہ ننگِ اُوست بودن در سخن، ہمتائے من

یعنی بو علی سینا کا ممدوح کی یکتائی پر میرے ساتھ اتفاقِ رائے کرنا اور عقلِ فعّال کا اس کو "کرمفربائے من" لکھنا یہ سب باتیں اس کی مدح کے لیے کافی نہیں ہیں؛ مختصر یہ کہ وہ ایسا شخص ہے کہ شعر میں مجھ جیسے شخص کا ہمسر و ہمتا ہونا بھی اس کے واسطے موجبِ ننگ و عار ہے۔ اس میں قطع نظر اس کے کہ ممدوح کی اور اس سے بھی زیادہ اپنی تعریف، ایک نہایت لطیف پیرایے میں بیان کی ہے، اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ ممدوح میری شاعری کو پسند نہیں کرتا۔

مرزا کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی کے مکان پر جب کہ راقم بھی موجود تھا، آزردہ اور غالب اور بعض اور مہمان جمع تھے۔ کھانے میں دیر تھی، فارسی دیوانِ غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے۔ ان میں ایک غزل تھی، جس کے مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطاب کیا تھا۔ اور جس کا مطلع یہ ہے:

نشاطِ معنویاں از شراب خانۂ تست ۔۔۔ فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

مرزا نے وہ اوراق اٹھا لیے اور مولانا آزردہ سے مزاح کے طور پر کہا: "دیکھیے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل کہی ہے۔" یہ کہہ کر غزل پڑھنی شروع کی۔ اوّل کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی، مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر، جیسی ان کی عادت تھی، کہنے لگے: "کلام مربوط ہے، مگر نوآموز کا کلام معلوم ہوتا ہے۔" سب حاضرین ہنس پڑے۔ جب مقطع کی نوبت آئی، مرزا نے مولانا کی طرف خطاب کر کے دردناک آواز سے یہ مقطع پڑھا:

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی ۔۔۔ مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

اس وقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزردہ شرما کر خاموش ہو رہے۔

صہبائی اور علوی بھی چوں کہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور مرزا غالب

نے اس طریقے کو بالکل چھوڑ دیا تھا، اس لیے وہ مرزا کو اور مرزا ان کو کم مانتے تھے۔ لیکن چوں کہ یہ تمام گروہ سخن فہموں اور سخن سنجوں کا تھا اور مشاعروں میں اکثر ایک دوسرے سے مڈبھیڑ رہتی تھی، مرزا کو اپنے خیالات کی اصلاح اور اپنے اشعار کی تہذیب و تنقیح میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی؛ اور یہی ان کی اصلی ترقی کی بنیاد تھی۔

غزل

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے فارسی غزل بھی اوّل مرزا بیدل وغیرہ کی طرز میں کہنی شروع کی تھی۔ چنان چہ اس قسم کی بہت سی غزلیں ان کے دیوان میں اب تک موجود ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ طرز بدلتی گئی اور آخر کار عرفی، ظہوری، نظیری اور طالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہوگیا۔ وہ اپنے دیوانِ فارسی کے خاتمے میں لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے:

اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی، لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں کی پیروی کرتا رہا، جو راہِ صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب اُن لوگوں نے جو اس راہ میں پیش رو تھے، دیکھا کہ میں باوجودے کہ اُن کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا ہوں، ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انھوں نے مجھ پر "مربیانہ" نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی؛ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اس کو فنا کر دیا؛ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ راہ باندھا؛ اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا۔ اب اس گروہِ والا شکوہ کے فیضِ تربیت سے میرا کلکِ رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار؛ جلوے میں طاؤس

ہے تو پرواز میں عنقا۔

مرزا کے اس بیان سے پایا جاتا ہے کہ وہ غزل میں خاص نظیری کی روش پر چلتے تھے، مگر ان کی غزلیات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی غزل میں نہ صرف نظیری، بلکہ عرفی، ظہوری، طالب آملی، جلال اسیر اور ان کے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ علی العموم پایا جاتا ہے۔ البتہ اس لحاظ سے کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے، ان کی غزل بلاشبہ نظیری کی غزل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ لیکن طرزِ بیان کے لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیت نہیں معلوم ہوتی۔

ناظم ہروی کی چند بیتیں مشہور ہیں، جن میں عنصری سے لے کر جامیؔ تک ہر زمانے میں جو شاعر سربرآوردہ ہوا ہے اس کا نام لیا ہے۔ ان کے آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کی ہے۔ چوں کہ اصل مثنوی اور اس پر مرزا کا اضافہ فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے اس لیے ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں۔

ناظم کہتا ہے:

شنیدم کہ در دور گاہِ کہن — شدہ عنصری شاہِ صاحب سخن

چو اورنگ از عنصری شد تہی — بہ فردوسی آمد کلاہِ رہی

چو فردوسی آورد سر در کفن — بہ خاقانی آمد بساطِ سخن

چو خاقانی از دارِ فانی گذشت — نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت

نظامی چو جامِ اجل درکشید — سرِ چترِ دانش بہ سعدی رسید

چو اورنگِ سعدی فروشد زکار — سخن گشت بر فرقِ خسرو نثار

ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید

اس کے بعد جو کمی ناظم کے بیان میں رہ گئی تھی، اس کو مرزا نے یوں پورا کیا ہے:

زجامی بہ عرفی و طالب رسید — زعرفی و طالب بہ غالب رسید

اگرچہ مرزا نے بیدل اور ان کے متبعین کی زبان اور ان کے اندازِ بیان میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا اور اس خصوص میں وہ اہلِ زبان کے طریقے سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتے تھے، مگر خیالات میں بیدلیت مدت تک باقی رہی۔ لیکن آخر کار تغزل میں بے انتہا گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی تھی۔ ہم اس مقام پر ان کی غزلیات میں سے زیادہ تر صاف صاف اور کسی قدر وہ اشعار بھی نقل کریں گے جن کے بغیر مرزا کی طرزِ تخیل اور ان کے شعر کی خصوصیت ظاہر نہیں ہو سکتی۔

انتخابِ غزلیاتِ فارسی

توحید

شاہدِ حسن ترا در روشِ دلبری — طرۂ پر خم صفات موی میاں ماسوا

یعنی اگر تیرے حُسن کو مثل شاہدانِ مجازی کے ایک شاہد قرار دیا جائے، تو اس کا طرۂ پرخم کیا ہوگا؟ صفاتِ الٰہی، اور اس کا موئے میاں کیا قرار پائے گا؟ ماسوی اللہ۔ شعرائے متصوفین صفاتِ الٰہی کو اکثر زلف و گیسو اور طرۂ و کاکل کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور چوں کہ ماسوئ اللہ کو صوفیہ معدومِ محض جانتے ہیں اور معشوق کی کمر کو عشاق معدوم قرار دیتے ہیں، اس لیے شاہدِ حسنِ حقیقی کی کمر ماسوئ کو قرار دیا ہے۔

توحید

آب نہ بخشی بزدر، خون سکندر ہدر — جاں نہ پذیری بہ ہیچ، نقدِ خضر نارَوا

ہَدر یعنی حلال۔ مشہور ہے کہ سکندر آبِ حیوان کی تلاش میں گیا تھا، مگر ناکام رہا۔

کہتا ہے کہ تو زورِ حکومت سے کسی کو پانی نہیں دیتا۔ پس اگر سکندر آبِ حیواں کے نہ ملنے کے سبب ہلاک ہو جائے، تو ہو۔ دوسرے مصرع میں خدا کی بے نیازی کا بیان ہے، یعنی خضر جان جیسی عزیز چیز مفت نذر کرتا ہے، مگر تو اس کو قبول نہیں کرتا اور اس لیے اس کو کسی طرح موت نہیں آتی۔

توحید

بزمِ ترا شمع و گل خستگیِ بوتراب سازِ ترا زیر و بم، واقعۂ کربلا

یعنی تیرے ہاں وہی سب سے زیادہ مقرب اور برگزیدہ ہیں جو سب سے زیادہ نشانۂ مصائب و حوادث و آلام ہیں۔

توحید

سادہ ز علم و عمل مہرِ تو ورزیدہ ام مستیِ ما پائدار، بادۂ ما ناشتا

ناشتا نہار منہ رہنا اور کچھ نہ کھانا، نہ پینا۔ دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ گویا میں نے شراب کا ایک قطرہ نہیں پیا، مگر نشے میں ہر وقت چور رہتا ہوں؛ یعنی گو علم و عمل کچھ نہیں رکھتا، مگر تیری محبت میں سرشار ہوں۔

قطعہ

توحید

اے خاکِ درت قبلۂ جان و دلِ غالب کز فیضِ تو پیرایۂ ہستی ست جہاں را

تا نامِ تو شیرینیِ جاں دادہ بہ گفتن درخویش فرو بردہ دل از مہر زباں را

یعنی آں حضرت کا نامِ مبارک لینے سے زبان میں ایسی شیرینی اور حلاوت پیدا ہوئی کہ دل نے پیار سے اس کو اپنے اندر اتار لیا۔

فخریہ

ما ہمائے گرم پروازیم، فیض از ما مجوے سایہ ہمچوں دود، بالا می رود از بالِ ما

یعنی ہماری پرواز میں اسی قدر گرمی ہے کہ جس طرح دھواں آگ سے اوپر ہی اوپر جاتا ہے، اسی طرح ہمارے پروں کا سایہ نیچے نہیں پڑتا، بلکہ دھوئیں کی طرح پروں کے اوپر ہی اوپر جاتا ہے۔

شوخی

حالِ ما از غیر می پرسی و منّت می بریم　　آگہی بارے کہ آگہ نیستی از حالِ ما

یعنی تو جو ہمارا حال غیر سے پوچھتا ہے، ہم اسی بات کے شکرگزار ہیں۔ غنیمت ہے کہ تو اس بات سے تو آگاہ ہے کہ تجھ کو ہمارے حال کی خبر نہیں

امّید

دلِ مایوس را تسکیں بمردن می تواں دادن　　چہ امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را

تصوّف

خطے بر ہستیِ عالم کشیدیم، از مژہ بستن　　ز خود رفتیم و ہم با خویشتن بُردیم دنیا را

عاشقانہ

وقفِ تاراج غمِ تست، چہ پیدا، چہ نہاں　　ہمچو رنگ از رُخِ ما رفت دل از سینۂ ما

جوئے از بادہ و جوئے ز عسل دار د خلد　　لبِ لعلِ تو ہم این ست و ہم آن ست مرا

فخریہ

خارہا از اثرِ گرمیِ رفتارم سوخت　　منّتے بر قدمِ راہ رواں ست مرا

یعنی راہ کے تمام خار و خس میری گرم رفتاری سے جل گئے ہیں، پس رہگیروں کے قدم پر میرا احسان ہے کہ میں نے ان کے لیے رستہ بالکل صاف کر دیا ہے۔

یہ تمام مضمون استعارے میں بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نازک خیالی کے طریقے میں جو الجھاؤ تھے، وہ سب میں نے اس طریقے پر چل کر دور کر دیے ہیں اور آئندہ آنے والوں کے لیے راہ صاف کر دی ہے۔

تمثیلِ حالاتِ خود

رہرو تفتہ، در رفتہ بہ آبم غالب   توشہ بر لبِ جُو ماندہ نشانست مرا

یعنی میری مثال اُس مسافر کی سی ہے جو گرمی اور لُو سے جلا بُھنا، پانی کو دیکھ کر، بے اختیار اس میں کود پڑے اور ڈوب جائے، اور ندی کے کنارے پر اس کا زادِ راہ پڑا رہ جائے، جس سے یہ معلوم ہو کہ یہاں کوئی مسافر ڈوبا ہے۔ اس شعر میں مرزا نے اپنی خاص حالت کو تمثیل کے پیرایے میں بیان کیا ہے۔ گویا یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں لوگوں نے مجھ کو محض اٹکل اور قرائن سے پہچانا ہے، ورنہ میں جیسا کہ میں ہوں، سب کی نظروں سے مخفی رہا ہوں۔

دُنیا

سایہ و چشمہ بصحرا دمِ عیشے دارد   اگر اندیشۂ منزل نبود رہزنِ ما

یہ دنیا کی مثال ہے، یعنی اگر آخرت کا کھٹکا نہ لگا ہوا ہو تو دنیا خاصی آرام کی جگہ ہے مگر چونکہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہے، اس لیے یہاں آرام کے ساتھ دم نہیں لیا جا سکتا۔

زار نالی

می برد مور، مگر جاں بسلامت ببرد   تا چہ برق ست کہ شد نامزدِ خرمنِ ما

یعنی معلوم نہیں کہ ہمارے خرمن پر کونسی بجلی گرنے والی ہے کہ چیونٹے جان بچانے کے لیے پہلے ہی سے اڑے جاتے ہیں۔ تمثیل کے پیرایے میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ دوست اور رفیق کوئی ہمارے رنج میں شریک نہیں ہوتا۔

فخریہ

سخنِ ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر   نہ شود گرد نمایاں ز رمِ توسنِ ما

یعنی ہمارے خیالات اس قدر لطیف ہیں کہ تحریر میں نہیں آسکتے، گویا ہمارے گھوڑے کی دوڑ میں گرد و غبار بالکل نہیں اُٹھتا۔

فخریہ

مانبودیم بدیں مرتبہ راضی، غالب! شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

یہ ملکۂ فطری کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ہم نے شاعری خود نہیں اختیار کی بلکہ ملکۂ شاعری نے خود ہم کو مجبور کیا کہ ہم اس کو اپنا فن قرار دیں۔

شکایت

با بندۂ خود ایں ہمہ سختی نمی کنند خود را بزور بر تو نگر بستہ ایم ما

یہ خطاب خداوندِ حقیقی کی طرف ہے، یعنی کیا ہم زبردستی سے تیرے سر ہو گئے ہیں کہ ہم پر ایسی سختی کی جاتی ہے۔

فخریہ

بر روے حاسداں درِ دوزخ کشودہ رشک از بہرِ خویش جنّتِ در بستہ ایم ما

یعنی ہم اپنا کمال دیکھ کر آپ ہی خوش ہوتے ہیں گویا ہم اپنے لیے جنّتِ دربستہ ہیں۔ پس چوں کہ ہماری جنّت کی کیفیت سے اور جو اس میں لذّت و راحت ہے اس سے، حاسد لوگ بے خبر ہیں، اس لیے رشک سے ان کی یہ حالت ہے کہ گویا ان پر دوزخ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

تصوّف

سوزِ ترا رواں ہمہ در خویشتن گرفت از داغ تہمتے بہ جگر بستہ ایم ما

یعنی تیرے سوز اور تیری آگ کو جان نے بالکل اپنے اندر لے لیا ہے، اور ذرّہ برابر کسی کے لیے اس میں سے حصہ نہیں چھوڑا۔ پس ہم جو اپنے جگر کو داغدار قرار دیتے ہیں، درحقیقت اس پر تہمت رکھتے ہیں۔

عاشقانہ

با چوں توئے معاملہ بر خویش منّت است
از شکوۂ تو شکر گزارِ خودیم ما

نازنالی

روے سیاہِ خویش ز خود ہم نہفتہ ایم　　　شمعِ خموشِ کلبۂ تارِ خودیم ما

رندانہ

کدوے چوں زمے یابم، چناں بر خویشتن بالم

کہ پندارم سرآمد روزگارِ بے نوائیہا

یعنی ایک شراب کا بھرا ہوا تونبا مجھ کو مل جاتا ہے، تو میں پھولا نہیں سماتا اور یہ سمجھتا ہوں کہ بس، اب بے سروسامانی کا زمانہ ختم ہوا۔

رندانہ

سخن کوتہ، مرا ہم دل بتقوی مائل ست، اما

زننگِ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائیہا

یعنی زاہد کے ساتھ ہم پیشہ ہونے سے عار آتا ہے، اس لیے میری کفار کی سی حالت ہے، ورنہ تقویٰ کی طرف مجھے بالطبع میلان تھا۔

اخلاق

درمشربِ حریفان منع است خودنمائی　　　بنگر کہ چوں سکندر آئینہ نیست جم را

حریفاں کا لفظ فارسی میں ایسا ہے، جیسا اُردو میں یار لوگوں کا لفظ؛ اور لفظی معنی اس کے ہم پیشہ ہیں۔ جب شراب خوار کسی کو حریف یا حریفاں کہتا ہے تو اس سے مراد شراب خوار ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم شراب خواروں کے مشرب میں خودنمائی منع ہے۔ دیکھو، جمشید، جو بادہ نوشی میں ضرب المثل ہے، اس کے ہاں آلۂ خودنمائی یعنی آئینہ جیسا کہ سکندر کے ہاں تھا، نہ تھا۔

شوخی

زناگسستنی و با دیگراں گرو بستنی　　　بیا کہ عہدِ وفا نیست استوار، بیا

یعنی اگر تو نے ہم سے توڑ کر غیروں کے ساتھ پیمانِ وفا باندھا ہے تو اس کا خیال نہ کر اور بے تکلف ہمارے پاس چلا آ، کیوں کہ عہدِ وفا ٹوٹنے ہی کے لیے باندھا جاتا ہے، وہ کبھی استوار نہیں ہوتا، جیسا کہ ہمارے ساتھ بندھ کر ٹوٹ گیا۔

عاشقانہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد　　　　ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

یعنی وداع میں اور لطف ہے اور وصل میں اور لذت ہے۔ پس ہزار بار جا اور لاکھ بار آ۔ صد ہزار بار نے شعر کو زیادہ بلیغ کر دیا ہے کیوں کہ شاعر باوجودے کہ لذت میں وداع اور وصل دونوں کو یکساں قرار دیتا ہے، مگر پھر بھی اپنے مطلب کی بات کو نہیں بھولا، اور جانے کے لیے ہزار بار اور آنے کے لیے صد ہزار بار کا لفظ استعمال کیا ہے۔

متصوفانہ

رواجِ صومعہ ہستی ست زینہار مرو　　　　متاعِ میکدہ مستی ست ہوشیار بیا

یعنی صومعہ میں ہستی و پندار و غرور کا رواج ہے، وہاں ہرگز نہ جا؛ اور میکدے کی جو کچھ پونجی ہے، وہ مستی ہے؛ یہاں ذرا ہوشیار ہو کر یعنی ظرفِ عالی لے کر آنا چاہیے۔ مستی حاصل کرنے کے لیے ہوشیار ہو کر آنا، اس میں جو لطف ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

رشک

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را　　　　رشک نگزارد کہ گویم نام را

زار حالی

گشتہ در تاریکیِ روزم نہاں　　　　کو چراغے تا بجویم شام را

یعنی میرا دن اس قدر تاریک تھا کہ شام کی تاریکی اور اس کی تاریکی دونوں مل گئیں اور یہ نہ معلوم ہوا کہ شام کب ہوئی اور دن کب چھپا۔

خلوص

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود   خوش بود گر دانہ نبود دام را

وہی مضمون ہے جو مرزا نے اُردو میں اس طرح باندھا ہے:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ   دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

رندانہ

دلستاں در خشم و غالب بوسہ جو   شوق نشناسد ہمی ہنگام را

عاشقانہ

در ہجر طرب بیش کند تاب و تبم را   مہتاب کفِ مارِ سیاہ ست شبم را

یعنی جدائی کے زمانے میں جو سامانِ عیش و طرب مہیا ہوتا ہے۔ اس سے میری بیقراری اور تپش زیادہ بڑھتی ہے۔ پس چاندنی جو کہ عیش و طرب کی محرک ہے، وہ میری کے حق میں مارِ سیاہ کے پھن کا حکم رکھتی ہے۔

غیرت

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم   گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

کہتا ہے کہ میں کیسا ہی پیاسا ہوں، لیکن اگر دریا کی موج پر مجھ کو یہ شبہہ بھی گزرے کہ دریا نے مجھے دیکھ کر پیشانی پر بل ڈالا ہے تو میں غیرت کے مارے ساحلِ دریا پر جان دے دوں گا، مگر حلق تر نہ کروں گا۔

عاشقانہ

بپایانِ محبت یاد می آرم زمانے را   کہ دل عہدِ وفا نابستہ دادم دلستانے را

اس شعر میں اپنی نادانی اور حماقت ظاہر کرتا ہے کہ اب انتہائے محبت میں جب کہ معشوق کی طرف سے ظلم و ستم و بے وفائی کی کچھ حد نہیں رہی، مجھے یہ خیال آتا ہے کہ افسوس ہے جب میں نے اس کو دل دیا تھا اس وقت وفاداری کا عہد نہ لے لیا۔ حالاں کہ

طے کا دینا کوئی اختیاری بات نہیں ہے کہ جس طرح بیع وشرا اور لین دین کے وقت شرطیں
کر لیتے ہیں اسی طرح دل دیتے وقت بھی کوئی شرط کر لی جاتی۔

رندانہ

آوازۂ شرع از سرِ منصور بلند است　　　　از شب رویِ ماست شکوہِ عسس ما

شب روی: چوری کے لیے راتوں کو پھرنا۔ کہتا ہے کہ اگر مجرموں کو تعزیر نہ دی جائے
تو شریعت کی شان وشوکت اور حکومت کی شکوہ ظاہر نہیں ہوتی۔ پس ہم جو مرتکب
جرائم ہوتے ہیں، گویا شریعت اور حکومت کی شان بڑھاتے ہیں۔

زار نالی

وقت است کہ خونِ جگر اندر دبجوشد　　　　چندانکہ چکد از مژۂ دادرس ما

کہتا ہے کہ میری مظلومی اب اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ وہ وقت آن پہنچا ہے کہ خونِ
جگر درد سے اس قدر اُبلے کہ حاکمِ دادرس کی پلکوں سے جا ٹپکے۔

آزادی

وردِ ہر فرو رفتۂ لذت نتواں بود　　　　برقند، نہ بر شہد نشیند مگسِ ما

یعنی ہم دنیا کی لذتوں سے متمتع ہوتے ہیں، مگر ان میں پھنستے نہیں، جیسے وہ مکھی جو
قند پر بیٹھتی ہے کہ جب چاہا اڑ گئی، نہ وہ مکھی جو شہد پر بیٹھتی ہے کہ پھر ابھر نہیں سکتی۔

رندانہ

بادۂ مشکبوی ما، بید و کنار کشتِ ما　　　　کوثر و سلسبیلِ ما، طوبیِ ما، بہشتِ ما

عاشقانہ

حسرتِ وصل از چہ رو، چوں بخیال سرخوشیم　　　　ابر اگر بایستد، بر لبِ جوست کشتِ ما

یعنی جب کہ ہم خیالِ دوست ہی میں مست وسرشار ہیں تو وصل کی حسرت کیوں کریں۔
اگر ابر نہیں برستا تو نہ برسے، ہماری کھیتی خود ندی کے کنارے پر ہے۔

رندانہ

بردہ صدرالعین لبسر، بر سرِ صد ہزار خُم　　گر بنہی در آفتاب، بادہ چکد زخشتِ ما
بادہ اگر بود حرام، بذلہ خلافِ شرع نیست　　دل نہ نہی بہ خوبِ ما، طعنہ مزن بزشتِ ما

زہاد کی طرف خطاب ہے جو شراب خوری اور رندانہ بذلہ سنجی دونوں کو بُرا سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر شراب حرام ہے تو بذلہ سنجی تو خلافِ شرع نہیں ہے؛ اگر تو شراب کو جو ہماری نفیس چیز ہے، پسند نہیں کرتا، تو بذلہ سنجی جو ہماری ادنیٰ درجے کی چیز ہے، اس پر تو طعن مت کر۔

تضمین مصرع طرح

گفت بحکمِ حسرتی غالبِ خستہ ایں غزل　　"شاد بہیچ می شود، طبع وفا سرشتِ ما"

یہ غزل غالباً اُس زمانے کی لکھی ہوئی ہے جب کہ نواب مُصطفےٰ خان مرحوم متخلص بہ حسرتی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور علوی، صہبائی، آزردہ، مومن اور نیّر وغیرہم سب اس میں شریک ہوتے تھے۔ اس مقطع میں مرزا نے مصرعِ طرح کو تضمین کیا ہے۔ اب اس کے یہ معنی ہو گئے کہ ہم سے جو اس طرح پر غزل لکھنے کی فرمایش کی گئی، ہماری طبعِ وفا سرشت دوست کے اتنے ہی التفات سے شاد شاد ہو جاتی ہے۔

عاشقانہ

مُردم زفرطِ ذوق و تسلی نہ می شوم　　یارب کجا برم لبِ خنجر ستائے را

کہتا ہے کہ دوست کے خنجر نے وہ مزا دیا ہے کہ اس کی تعریف کرتا کرتا مر گیا اور پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔ الٰہی اس لبِ خنجر ستا کو کہاں لے جاؤں کہ جہاں جا کر تسلی ہو۔

رندانہ

شبم تاریک و منزل دور و نقشِ جادہ ناپیدا　　ہلاکم جلوۂ برقِ شرابِ گاہ گاہے را

پہلے مصرع میں اپنی مشکلات کو شبِ تاریک وغیرہ کی تمثیل میں بیان کیا ہے۔ دوسرے مصرع میں کہتا ہے کہ میں ہلاک یعنی قربان ہوں برقِ شراب کی چمک پر، جو کبھی کبھی چمک

جاتی ہے اور اس اندھیرے میں کچھ روشنی نظر آ جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ شراب جو کبھی کبھی مل جاتی ہے، صرف اس کی بدولت میرا غم غلط ہوتا ہے۔

رندانہ

مے باندازہ حرام آمدہ، ساقی! برخیز   شیشۂ خود بشکن بر سرِ پیمانہ ما

برخلاف عقل و شرع کے کہتا ہے کہ اے ساقی، شراب اعتدال کے ساتھ پینی حرام ہے، تو اُٹھ اور اپنا شیشہ یعنی بوتل یا صراحی ہمارے گلاس پر دے مار۔ اس شعر میں افراطِ شوق کی تصویر کھینچی ہے، خواہ کسی چیز کا شوق ہو۔ جب کسی چیز کی طلب اور خواہش حد سے گزر جاتی ہے تو اس بات کی حس نہیں رہتی کہ اپنے ظرف کے موافق اس کی خواہش کی جائے۔ جب پانی کی پیاس نہایت شدت سے ہوتی ہے، تو پیاسا دریا کو دیکھ کر یہ چاہتا ہے کہ سارے دریا کو پی جاؤں۔ پس گو کہ مضمونِ شعر شراب کی تمثیل میں بیان کیا گیا ہے، لیکن اس کا مصداق ہر چیز کا مشتاق قرار پا سکتا ہے۔

زار نالی

مُو بر آید زکفِ دست اگر دہقاں را   نیست ممکن کہ کشد ریشہ سر از دانۂ ما

ظاہر ہے کہ انسان کی ہتیلی میں بال پیدا ہونے کی قابلیت نہیں رکھی گئی۔ کہتا ہے کہ اگر کاشتکار کی ہتیلی میں بال بھی نکل آئیں، تو بھی یہ ممکن نہیں کہ ہمارا دانہ پھوٹ کر اُس میں سے ریشہ نکل آئے، یعنی ہماری کوششوں کا مشکور ہونا محال ہے۔

تصوف

خرابیم و رضائیش در خرابیہائے ما باشد   زچشمِ بد نگہ دارد خدا ما دوست کاماں را

خراب، مست، ویران اور تباہ تینوں معنوں میں آتا ہے۔ دوست کام وہ شخص جس کی حالت دوستوں کی خواہش کے موافق ہو، یعنی عمدہ حالت ہو۔ کہتا ہے کہ ہم خود بھی خراب ہیں اور دوست کی خوشی بھی یہی ہے کہ خراب حال رہیں۔ پس ہم دوست کاموں

کو جن کی حالت دوست کی مرضی کے موافق ہے خدا تعالیٰ نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔

مناجات

بسا افتادہ سرمست و بسا افتادہ در طاعت　　　تو دانی تا بلطف از خاک برداری کداماں را

تصوف

عالم آئینۂ راز ست، چہ پیدا، چہ نہاں　　　تابِ اندیشہ نداری، بہ نگاہے دریاب

یعنی اگر تو سوچ نہیں سکتا، تو نگاہ ہی سے عالم کو دیکھ کہ اس کا ظاہر و باطن سب مظہرِ اسرارِ الٰہی ہے۔

تصوف

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار　　　نیست گر صبحِ بہاری، شبِ ماہے دریاب

شوخی

گر پس از جور بہ انصاف گراید، چہ عجب　　　از حیا روے بما گر ننماید، چہ عجب!

کہتا ہے کہ ظلم و ستم کے بعد اگر وہ انصاف کی طرف مائل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں یعنی اپنے پچھلے جرم یاد کر کے حیا سے ہم کو منہ نہ دکھلائے تو تعجب نہیں۔ مطلب یہ کہ انصاف بھی کرے گا تو اس طرح کرے گا کہ ہم اس کے دیکھنے سے محروم رہیں۔

شوخی

بودش از شکوہ خطر، ورنہ سری داشت بمن　　　بمزارم اگر از مہر بیاید، چہ عجب

خیالی پلاؤ پکاتا ہے تاکہ اسی طرح اپنے دل کو تسکین دے۔

معذرت

باچنیں شرم کہ از ہستیِ خویشش باشد　　　غالب ار رخ برہِ دوست نساید چہ عجب

یعنی اس شرم سے کہ اپنے تئیں غلطی سے موجود سمجھ رہا ہے، اگر غالب خدا کے آگے سجدہ نہ کرے تو کچھ عجب نہیں۔

غزل نعتیہ

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است

آیینہ دار پرتوِ مہرست ماہتاب
شانِ حق آشکار زشانِ محمدؐ است

تیرِ قضا ہر آیینہ در ترکشِ حق است
اما کشادِ آن ز کمانِ محمدؐ است

دانی اگر، بہ معنیِ لولاک وا رسی
خود ہر چہ از حق است ازانِ محمدؐ است

ہر کس قسم، بدانچہ عزیزست، می خورد
سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ است

واعظ! حدیثِ سایۂ طوبیٰ فرو گزار
کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ است

بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را
کان نیمہ جنبشے ز بنانِ محمدؐ است

غالب! ثنای خواجہ بہ یزدان گذاشتیم
کان ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

یہ غزل مرزا کے اپنی عام طرز کے خلاف نہایت صاف اور بلیغ لکھی ہے۔ راقم نے مرزا کی زندگی ہی میں اس غزل کی تخمیس کی تھی اور مرزا صاحب کو بھی دکھائی تھی۔ چوں کہ وہ تخمیس اب تک شایع نہیں ہوئی، اس لیے مقتضاے مقام یہ ہے کہ اس کو بھی اس غزل کے ساتھ نقل کر دیا جائے:

اعجاز از خواصِ لسانِ محمدؐ است
عین الحیوٰۃ گم بہ دہانِ محمدؐ است

گر نور و گر ہدیٰ کہ ازانِ محمدؐ است
"حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است

"آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است"

دانی ز پیشِ چشمِ تو برخیزد ار حجاب
کز نورِ شمع پردۂ فانوس راست تاب

باشد ظہورِ روشنیِ عارض از نقاب
"آیینہ دار پرتوِ مہرست ماہتاب"

"شانِ حق آشکار زشانِ محمدؐ است"

لطفِ خداست، گر بسرِ کس نہاد دست
قہرِ خداست، چوں ز سرِ کین بجملہ جست

دانند کسیکہ شد ز پئے "ما رمیتَ" مست
"تیرِ قضا ہر آینہ در ترکشِ حق است"

"اما کشاد آں ز کمانِ محمدؐ است"

گوئی، اگر بعالمِ ادراک وا رسی — بینی، اگر بدیدۂ دراک وا رسی

سنجی، اگر بمرتبۂ خاک وا رسی — "دانی، اگر بمعنیِ لولاک وا رسی"

"خود ہر چہ از حق است، از انِ محمدؐ است"

شاہد بقتلِ عاشق و عاشق بخال و خد — مجنوں بپائے لیلی و لیلیٰ بہ فرقِ خود

مومن بہ آلِ احمد و آتش بروحِ جد — "ہر کس قسم بدانچہ عزیز ست، می خورد"

"سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ است"

اے خامہ بوصفِ قامتِ معشوق کم نگار — اے دل! سخن زراست قداں درمیاں میار

قمری! ز ذکرِ سرو نفس را نگاہ دار — "واعظ! حدیثِ سایۂ طوبیٰ فرو گزار"

"کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ است"

حکمش بمہر و ماہ روانست چوں قضا — دیدی کہ باز گشتنِ خورشید بر قضا

بودہ است بر اشارۂ ابروے مصطفیٰؐ — "بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را"

"کاں نیمہ جنبشے ز بنانِ محمدؐ است"

آنجا کہ از مناقبِ عترت سخن رود — وز آل و از صحابۂ امت سخن رود

واں کاینہمہ ز ختمِ رسالت سخن رود — "وز خود ز نقشِ مہرِ نبوت سخن رود"

"آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ است"

ہمت بمدحِ شہ من و عالی گماشتیم — گفتیم و از نگاشتنی ہا نگاشتیم

چوں کام و لب فراخورِ وصفش نداشتیم — "غالب! ثنای خواجہ بہ یزداں گذاشتیم"

"کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است"

شوخی

بیخود بوقتِ ذبح تپیدن گناہِ من — دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست؟

یا داز عدو نیارم وایںہم زدور بینی ست   کاندر دلم گذشتن، با دوست ہمنشینی ست

کہتا ہے، میں جورِ قیب کا خیال دل میں نہیں لاتا، یہ دور بینی کی بات ہے کیوں کہ میرے دل میں ہر وقت دوست رہتا ہے، اگر رقیب کا خیال دل میں آئے گا تو گویا رقیب دوست کے ساتھ ہمنشین ہو جائے گا۔

شوخی

من سُوے او بہ بینم، داند، زبیحیائی ست   اُو سُوے من نہ بیند، دانم، از شرمگینی ست

عاشقانہ

چہ فتنہ ہا کہ در اندازۂ کمانِ تو نیست   قیامت ست! دل دیر مہربانِ تو نیست

رواں فداے تو! نامے کہ بردۂ ناصح!   زہے لطافتِ ذوقیکہ، در بیانِ تو نیست!

چوں کہ ناصح ترکِ عشق کی نصیحت کرتا ہے، اس لیے معشوق کا نام عاشق کے سامنے اچھی طرح نہیں لیتا۔ شاعر ناصح کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے کہ میری جان تجھ پر قربان ہو، تو نے کس کا نام لیا ہے؟ وہ کیسی لطافت اور لذّت ہو گی، جو کہ تیرے بیان میں نہیں ہے؟ یعنی جس طرح اس کا نام لینا چاہیے تھا اگر اس طرح تو بھی وہ نام لیتا، تو کیسی لطافت اور لذّت تیرے بیان میں ہوتی۔ مگر چوں کہ ناصح نے بُری طرح سے اس کا نام لیا ہے، اس لیے کہتا ہے کہ وہ کیسی لطافت ہو گی جو تیرے بیان میں نہیں ہے۔

عاشقانہ

دل از خموشیِ لعلت امیدوار چرا ست   چہ گفتۂ بہ زبانے کہ در دہانِ تو نیست

معشوق نے منہ سے کچھ نہیں کہا مگر اس کی نگاہ یا تبسم یا کسی اور ادا سے اس کے التفات با وصل کی امید بندھی ہے۔ پس کہتا ہے کہ تیرے لعلِ لب کی خاموشی سے میرا دل اس قدر کیوں امیدوار ہے؟ تو نے اُس زبان سے جو تیرے منہ میں نہیں ہے کیا کہہ دیا ہے جس سے اس کو امید بندھی ہے۔

عاشقانہ

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی بداست مرگ، ولے بدتر از گمانِ تو نیست

اخلاق

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست قعرِ دریا سلسبیل و رُوے دریا آتش ست

دوسرے مصرع میں عرفی کے مضمون کو الٹا ہے۔ اُس نے اس لحاظ سے کہ دریا کے اوپر کی سطح سے راحت حاصل ہوتی ہے اور دریا کی تہ میں پہنچنے سے وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے، جو آگ میں جل جانے سے ہوتا ہے، یوں کہا تھا:

رُوی دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست

مرزا کہتے ہیں کہ بلا کا خوف خود بلا سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ چناں چہ دریا میں انسان جب ہی تک بے چین رہتا ہے جب تک ڈوب جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جب ڈوب گیا، پھر کچھ بھی بے چینی باقی نہیں رہتی۔ پس یوں کہنا چاہیے کہ

قعرِ دریا سلسبیل و رُوے دریا آتش ست

شوخی

پاک خور امروز و زنہار از پے فردا منہ در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش ست

جو لوگ شرابِ طہور کی امید پر دنیا میں شراب نہیں پیتے، وہ گویا جو شراب آج نہیں پیتے، اُس کو کل کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ پس ان سے کہتا ہے کہ "پاک خور امروز" یعنی سب آج ہی نبیڑ دے، اور کل کے لیے مت رکھ، کیوں کہ شریعت میں شراب آج تو پانی ہے، اور کل وہی آگ ہو جاوے گی

تصوف

زوہم نقشِ خیالی کشیدہ، ورنہ وجودِ خلق چو عنقا بدہر نایاب است
توی فتادہ چو نسبت، ادب مجو، غالب! ندیدہ کہ سوی قبلہ پشتِ محراب است!

یعنی جب تعلق اور نسبت قوی ہو جائے، تو پھر آدابِ ظاہری کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ دیکھو قبلہ کی طرف پشت کرنا ہر ایک کے لیے خلافِ ادب ہے، مگر محرابِ مسجد جس کو قبلہ سے نہایت مضبوط تعلق ہے، اس کی پشت ہمیشہ قبلہ ہی کی طرف رہتی ہے۔

شوخی

ہر چہ فلک نخواستہ است، ہیچکس از فلک نخواست
ظرفِ فقیہ مے نہ جست، بادۂ ما گزک نخواست

تصوف

بحث و جدل بجای ماں، میکدہ جوی کاندراں
کس نفس از جمل نزد، کس سخن از فدک نخواست

بجاے ماں بمعنی بجاے دار یعنی بحث و جدال کو یونہیں رہنے دے اور میخانے میں جا کر وہاں نہ جمل کا جھگڑا ہے، نہ فدک کا قصہ ہے۔ جمل سے مراد جنگِ جمل ہے، جس میں حضرت عائشہ جمل یعنی اونٹ پر سوار ہو کر حضرت امیر سے لڑنے گئی تھیں۔ فدک ایک کھجور کا باغ تھا، جس پر حضرت سیدۃ النسا فاطمہؓ زہرا نے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت میں وراثت کا دعوی کیا تھا۔ یہ دونوں جھگڑے منجملہ ان بے شمار نزاعوں کے ہیں جن پر سُنی شیعوں میں ہمیشہ سر پھٹول رہتی ہے۔

فخریہ

دل جلوہ مید ہد ہنرِ خود در انجمن رحمے مگر بجانِ حسودش نماندہ است

یعنی جب تک میں اپنے تئیں چھپاتا تھا، حاسدوں کو کچھ آزار نہیں پہنچتا تھا؛ اب علی الاعلان اپنے ہنر ظاہر کرنے لگا ہوں۔ گویا اب حاسدوں کی جان پر رحم باقی نہیں رہا۔

بے دماغی

غالب زباں بُریدہ و آگندہ گوش نیست آما دماغ گفت و شنودش نماندہ است

عاشقانہ

بلبل! دلت بنالۂ خونیں بہ بند نیست آسودہ زی کہ یارِ تو مشکل پسند نیست

یعنی اے بلبل! تو اپنے نالۂ خونیں کے سبب ضیق میں نہیں ہے، جب چاہتی ہے، نالہ کرتی ہے۔ پس تو آرام سے زندگی بسر کر کہ تیرا یار یعنی گُل مشکل پسند نہیں ہے، بخلاف ہمارے کہ ہم کو رونے اور فریاد کرنے کی بندی ہے، حال آنکہ نالۂ خونیں سے دل بھرا ہوا ہے۔

تصوّف

بیخود بزیرِ سایۂ طوبیٰ غنودہ اند شبگیر رہروانِ تمنا بلند نیست

یعنی جو لوگ امانی د آمال کے پھندے میں گرفتار ہیں، ان کا سفر کچھ لمبا چوڑا نہیں ہے، ان کا منتہائے مقصود طوبیٰ کے سایہ میں آرام کرنا ہے۔

شکایتِ سخن

اختری خوشتر از نیم بجہاں می بایست حرفِ پیرم را بختِ جواں می بایست

فخریہ

تا تنک مایہ بدریوزہ خود آرا نہ شود نرخِ پیرایۂ گفتار گراں می بایست

فخریہ

گفتم بروزگار سخنور چو من بسی ست گفتند اندریں کہ تو گفتی سخن بسی ست

مشکیں غزالہا کہ نہ بینی بہ ہیچ دشت در مرغزار ہائے خطا و ختن بسی ست

در صفحۂ نبودم ہمہ آں چہ در دل ست در بزم کمتر است گل و در چمن بسی ست

رندانہ

دراز دستیِ من چاکے ار فگند چہ عیب!
زبیش دلقِ ورع باہزار پیوند است

نگفتہ، کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر
برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند ست

یہ خطاب ناصح کی طرف ہے۔

عاشقانہ

اگر نہ بہرِ من، از بہرِ خود عزیزم دار
کہ بندہ، خوبیِ اُو خوبیِ خداوند ست

تصوّف

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم
باما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

یعنی ہم کو آگے جانے کی جلدی ہے۔ ہم سایہ و سرچشمہ یعنی طوبیٰ اور کوثر پر آرام نہیں لے سکتے۔

تصوّف

آں راز کہ در سینہ نہانست، نہ وعظ ست
بردار تواں گفت، بہ منبر نتواں گفت

شوخی

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا
مومن نہ بود غالب و کافر نتواں گفت

رندانہ

گفتم، ز کہ پُرسم اثرِ عمرِ گزشتہ
ساقی بہ قدح بادۂ دہ سالہ فرو ریخت

شوخی

در قالبِ مُلّا اثرش پردہ کُشا شُد
خاکے کہ قضا در تنِ گوسالہ فرو ریخت

دوستی

گر منافق، وصل ناخوش؛ ور موافق، ہجر تلخ
دیدہ داغم کرد رُوے دوستاں دیدن نداشت

یعنی دوستوں کا منہ دیکھنا اور ان سے تعارف پیدا کرنا نہیں چاہیے تھا کیوں کہ جو منافق ہیں اُن کا ملنا ناگوار ہے اور جو موافق ہیں، ان کی جدائی تلخ ہے۔

انسان

بُرد آدم از امانت ہر چہ گردوں بر نتافت ریخت مَے بر خاک، چوں در جام گنجیدن نداشت

یعنی بارِ امانت میں سے جو کچھ آسمان سے نہ اٹھ سکا وہ انسان نے اٹھالیا۔ گویا جب شراب جام میں نہ سما سکی تو خاک پر گر پڑی۔ خاک کا لفظ انسان کے لیے اور جام آسمان کے لیے کس قدر مناسب واقع ہوا ہے۔ اور بارِ امانت جو انسان پر ڈالا گیا تھا اس کی تشبیہ اس شراب سے جو پیالہ چھلکنے سے زمین پر گر پڑے، کیسی لطیف و پاکیزہ تشبیہ ہے۔

تصوّف

قفس و دام را گنا ہے نیست ریختن در نہادِ بال و پرست

نہاد، جبلّت کو کہتے ہیں۔ قفس اور دام دونوں جانور کے لیے تکلیف اور اذیت کے مقام ہیں، جہاں اکثر جانور تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے اور اس کے بال و پر گر جاتے ہیں۔ یہاں قفس اور دام سے دنیا اور اس کی تکلیفات مراد ہیں۔ کہتا ہے کہ قفس اور دام پر کچھ الزام نہیں ہے، بال و پر گرنے ہی کے لیے بنے ہیں اور جاندار مرنے ہی کے لیے پیدا ہوا ہے۔

تصوّف

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند ہم خزاں ہم بہار در گذر است

یعنی خزاں اور بہار دونوں رفتنی ہیں؛ اُس میں پتے جھڑتے ہیں، تو اس میں پھول جھڑتے ہیں۔

عاشقانہ

بے تو گر زیستہ ام سختیِ ایں درد بسنج بگذر از مرگ کہ وابستہ بہنگامے ہست

یعنی موت کے لیے تو ایک وقت معیّن ہے، اس سے قطع نظر کر اور یہ خیال مت کر کہ اب تک مرا کیوں نہیں، بلکہ یہ دیکھ کہ اب تک زندہ کیوں کر رہا اور کیوں کر جدائی کے رنج اور

تکلیف کو برداشت کیا۔

رندانہ

کیست در کعبہ کہ رطلے زنبیذم بخشد   در گروگاں طلبد، جامۂ احرامے ہست

رطل، پیمانہ، شراب۔ نبیذ، شراب۔ گروگان، وہ شے جس کو گرو رکھیں۔ جامۂ احرام، وہ بن سلا کپڑا جو مناسکِ حج کے ختم ہونے تک حاجی پہنے رہتے ہیں۔

عاشقانہ

نہ بدرجستہ شرارے نہ بجا ماندہ رماد   سوختم، لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

رماد، راکھ۔ پہلا سوختم، لازمی۔ دوسرا سوختم، متعدی۔ کہتا ہے، میں جل تو ضرور گیا، مگر معلوم نہیں، اس نے کس طرح مجھے جلا دیا، نہ کوئی پتنگا اڑا اور نہ راکھ باقی رہی۔

عاشقانہ

با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام   داند کہ حور و کوثر و دارالسّلام چیست

دوست کو حور سے، بادہ کو کوثر سے، اور خلوت کو دارالسّلام یعنی جنّت سے تشبیہ دی ہے۔

رندانہ

دل خستۂ غمیم و بود ئے دوائے ما   با خستگاں[1] حدیثِ حلال و حرام چیست

شوخیِ رندانہ

از کاسۂ کرام نصیب است خاک را   تا از فلک نصیبۂ کاسِ کرام چیست

شوخی

نیکی ز تست، از تو نخواہیم مزدِ کار   ور خود بدیم کارِ تو ایم، انتقام چیست

یعنی اگر ہم نے نیکی کی ہے تو وہ تیری ہی طرف سے ہے، اس کی اُجرت ہم نہیں چاہتے۔

---

[1] یعنی بیماراں و معذوراں

اور اگر ہم بد ہیں، تو تیرا فعل یعنی تیرے بنائے ہوئے ہیں، پھر سزا کس لیے ہے؟

شوخی

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت   پرسد چرا کہ نرخِ مے لعل فام چیست

یعنی غالب کے گھر میں صرف ایک پرانا خرقہ اور ایک مصحف تھا اور کچھ نہ تھا۔ پس اس نے ان کو اگر بیچ نہیں دیا، تو شراب کا بھاؤ کیوں پوچھتا پھرتا ہے۔ "بہم فروخت" کے لفظ میں یہ شوخی رکھی ہے کہ اگر دونوں کو ایک ساتھ نہ فروخت کیا ہوگا، تو شراب کی قیمت نہ ادا ہو سکے گی۔

عاشقانہ

لطفِ خدائے ذوقِ نشاطش نمی دہد   کافردلے کہ باستمِ دوست خو گرفت

یعنی وہ کافر دل جو معشوق کے ظلم سہنے کا عادی ہو، اس کو خدا کی مہربانی میں بھی مزا نہیں آتا۔ بظاہر یہ ایک شاعرانہ شوخی معلوم ہوتی ہے، مگر درحقیقت یہ ایک نیکٹ ہے، جو ہوا و ہوس کے کوچے میں ہمیشہ گزرتا رہتا ہے۔ بوالہوس لوگ سب ذلتیں گوارا کرتے ہیں، جدائی کے صدمے، رشک کی جلن، ذلت و بے آبروئی، معاشیق کی بے التفاتی اور بے اعتنائی وغیرہ سب کچھ سہتے ہیں، مگر ہوا و ہوس سے باز نہیں آتے، اور پارسائی و عفت کا طریقہ جو باعثِ خوشنودیِ خدا ہے، اس کو اختیار نہیں کر سکتے۔

شوخی

رضوان چو شہد و شیر بغالب حوالہ کرد   بیچارہ باز داد و مے مشکبو گرفت

رموزِ دیں نشناسم درست و معذورم   نہادِ من عجمی و طریقِ من عربی است

یعنی میں پیدا تو عجم میں ہوا ہوں اور میرا مذہب عربی ہے۔ پس اگر اصولِ مذہب سے واقف نہ ہوں، تو مجھ کو معذور سمجھنا چاہیے۔

ترکِ فعول

نشاطِ جم طلب از آسمان، نہ شوکتِ جم　　قدح مباش زیاقوت، بادہ گر عنبی ست

دوسرا مصرع مثال ہے پہلے مصرع کے مضمون کی یعنی انگوری شراب چاہیے، جس سے جمشید کا سا عیش حاصل ہو، یاقوت کا پیالہ جس سے جمشید کی سی شاہانہ شوکت ظاہر ہو اگر نہ میسّر ہو تو نہ سہی۔

فخریہ

ہرآنچہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست　　عیارِ بیکسیِ من شرافتِ نسبی است

یعنی جس کو دیکھیے اپنی جنس کی طرف مائل ہے۔ چونکہ شرافتِ نسب میں کوئی میری مثل نہیں ہے، اس لیے میری طرف کوئی مائل نہیں، اور یہی میری بیکسی کی وجہ ہے۔

تصوّف

نشاطِ معنویاں از شرابخانۂ تست　　فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

اس تمام غزل میں معشوقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے۔

تصوّف

بجام و آئینہ حرفِ جم و سکندر چیست　　کہ ہرچہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست

یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جامِ جہاں نما جمشید کے عہد میں تھا اور آئینہ سکندر کے عہد میں کیوں کر جو کچھ جس زمانے میں گزرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا۔

تصوّف

ہم از احاطۂ تست اینکہ در جہاں مارا　　قدم بہ بتکدہ و سر بہ آستانۂ تست

یعنی تو جو تمام عالم پر محیط ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہیں تو بتکدے میں، مگر ہمارا سر تیرے آستانے پر ہے۔

تصوّف

سپہر را تو بہ تاراج ما گماشتہ، نہ ہر چہ دُزد زما بُرد، در خزانہ، تست؟

یعنی کیا یہ بات نہیں کہ جو کچھ لٹیرا ہم سے لوٹ کرلے گیا ہے، وہ تیرے خزانے میں موجود ہے؟

تصوّف

مرا چہ جُرم، گر اندیشہ آسماں پیماست نہ تیز گامی توسن ز تازیانہ، تست؟

اس شعر میں ضمناً اپنے خیال کی بلند پروازی کا اظہار ہے اور اصل مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ تیری ہی طرف سے ہے۔ یعنی اگر میرا خیال اپنی حد سے تجاوز کر کے عالم بالا کے اسرار و غوامض میں دخل دیتا ہے تو میرا کیا قصور ہے؟ تیرے تازیانے نے گھوڑے کو تیز رفتار کر دیا ہے۔

شوخی

شباب و زہد، چہ ناقدردانِ ہستی ست بلا بجانِ جوانانِ پارسا ریزد

تصوّف

آخرِ منزلِ نخست خوی تو راہ می زند اوّلِ منزلِ دگر بُوے تو زاد می دہد

یعنی سالک جب تیری راہ میں قدم رکھتا ہے اور پہلی منزل قریب ختم ہونے کے ہوتی ہے، تو سخت مشکلات اور امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے اور دوسری منزل شروع ہوتی ہے، تو لذتِ قرب حاصل ہونے لگتی ہے، جو مثل زادِ راہ کے آگے بڑھنے کی ہمت بندھواتی ہے۔

تصوّف

اے کہ بدیدہ نم ز تست، و یکہ بسینہ غم ز تست نازشِ غم کہ ہم ز تست، خاطرِ شادمی دہد

مستِ عطاے خود کند ساقیِ ما نہ مستِ مے دادہ زیادمی برد، بلکہ زیاد می دہد

یعنی ہمارا ساقی شراب سے مست نہیں کرتا، بلکہ اپنی عطا و بخشش سے مست کرتا ہے۔

چوں کہ وہ ہر دفعہ پہلے سے زیادہ دیتا ہے اس لیے ہم پہلا دیا ہوا بھول جاتے ہیں؛ اس کے احسان کے نشے پر شراب کا نشہ غالب نہیں آنے پاتا۔

اخلاق

دل ز اسبابِ طرب گم کردہ در بندِ غم ناں شد — زراعت گاہِ دہقاں می شود چوں باغ ویراں شد

یہ مضمون مرزا کے حسب حال ہے اور عموماً مسلمانوں کی حالت پر صادق آتا ہے۔ اوّل عیش و عشرت اور پھر نون تیل لکڑی کی فکر۔ زراعت اور باغ کی مثال کس قدر مثل لہ کے مطابق واقع ہوئی ہے۔

زہ گرم است ایں ہنگامہ بنگر شورِ ہستی را — قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

یعنی جو کچھ دنیا میں فتنے اور فساد اور جنگ و جدال اور شور و غوغا ہے، وہ انسان ہی کے دم سے ہے۔ اگر حضرتِ انسان نہ ہوتے تو تمام عالم میں سناٹا ہوتا۔

قضا از ذوقِ معنی شیرہ می ریخت در جانہا — نمے از لائے پالائش چکیدہ آبِ حیواں شد

لائے پالا، صافی کو کہتے ہیں، باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

جلوہ اے داغ کہ ذوقم ز نمک می خیزد — مژدہ اے درد کہ ننگم ز دوا می آید

یعنی اے داغ اب تیرے ظاہر ہونے کا وقت آگیا کیوں کہ نمک جو تیرے طول پکڑنے اور ترقی پانے کا باعث ہے، مجھے اس میں مزا آنے لگا ہے اور اے درد، تیری بن آئی ہے کیوں کہ مجھے دوا سے ننگ آنے لگا ہے۔

تصوف

ہمچو رازے کہ بمستی ز دل آید بیروں — در بہاراں ہمہ بوئیت ز صبا می آید

اس شعر میں معشوقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے اور اس حدیث کے مضمون کی طرف اشارہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہِ فی اَیَّامِ دَہرِکُم نَفَحَاتٍ اَلَا فَتَعَرَّضُوا لَہَا۔

آزادی

خوش است آنکہ با خویش جز غم ندارد ولے خوشتر است آنکہ ایں ہم ندارد

عشق

سرابے کہ رخشد بویرانہ خوشتر ز چشمے کہ پیرایۂ نم ندارد

یعنی وہ سراب جو صحرا میں چمکے، اُس آنکھ سے بہتر ہے جو تر نہیں ہے۔

شوخی۔

سخن نیست در لطفِ ایں قطعہ غالبؔ! بہشتے بود ہند کادم ندارد

قطعہ سے مراد قطعۂ زمین ہے۔

تصوّف

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

رخ کشودند و لبِ ہرزہ سرایم بستند دل ربودند و دو چشمِ نگرانم دادند

فخریہ

سوخت آتشکدہ، ز آتش نفسم بخشیدند ریخت بتخانہ، ز ناقوس فغانم دادند

گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

افسر از تارکِ ترکانِ پشنگی بُردند بہ سخن ناصیۂ فرکیانم دادند

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند ہر چہ بُردند بہ پیدا، بہ نہانم دادند

رندانہ

ہر چہ در جزیہ ز گبراں مےِ ناب آوردند بشبِ جمعۂ ماہِ رمضانم دادند

زارنالی

ہر چہ از دستگہِ پارس بہ یغما بُردند تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

اخیر کے چھ شعروں میں اس بات کا بیان ہے کہ قضا و قدر نے جو کچھ عرب کی فتوحات کے

وقت عجم سے چھینا، اس کے عوض میں مجھ کو کہ میں بھی عجمی الاصل ہوں، کچھ نہ کچھ دیا۔ جب آتشکدہ جل کر راکھ ہو گیا تو مجھے آتش کی جگہ نفس یعنی زبان دی، اور جب بت خانہ گر گیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ و فغاں دی۔ شاہانِ عجم کے جھنڈوں کے موتی اتار لیے اور اس کے عوض میں مجھے خامۂ گنجینہ فشاں عنایت کیا۔ اسی طرح ترکوں کے سر سے تاج لوٹ لیا اور مجھ کو شاعری میں اقبالِ کیانی مرحمت فرمایا۔ پھر کہتا ہے کہ موتی تاج میں سے تو توڑ لیے اور علم و دانش میں جڑ دیے، یعنی جو کچھ علی الاعلان لوٹا تھا، وہ مجھے چپکے سے دے دیا۔ اور آتش پرستوں سے جو شراب جزیے میں لی، وہ ماہِ رمضان کی شبِ جمعہ کو مجھے پلائی۔ خلاصہ یہ کیا کہ جو کچھ پونجی لوٹی تھی، اُس میں سے زبان مجھ کو فریاد کرنے کے لیے دے دی۔

عاشقانہ متصوفانہ

خوباں نہ آں کنند کہ کس را زیاں رسد دل بُرد، تا دگر چہ ازاں دلستاں رسد

یعنی دل لیا ہے تو ضرور اس کے عوض میں کچھ اس سے وصول ہو گا کیوں کہ اچھے لوگ ایسا کام نہیں کرتے کہ کسی کو نقصان پہنچے۔

تصوّف

مقصودِ ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست ہر جا کنیم سجدہ، بداں آستاں رسد

گم شد نشانِ من چو رسیدم بکنجِ دیر مانندِ آں صدا کہ بگوشِ گراں رسد

شعرائے متصوفین دیر و خرابات و میکدے سے اکثر خانقاہ، یا وہ مقام، جہاں فقر و فنا کی تعلیم ہوتی ہے، مراد لیتے ہیں۔ اپنا نشان دَیر میں پہنچ کر گم ہو جانے سے مراد فنا ہے۔ اس کی تشبیہ اس صدا سے جو بہرے آدمی کے کان تک پہنچ کر گم ہو جاتی ہے، کس قدر بلیغ تشبیہ ہے۔

اعزازِ نفس

در دام بہرِ دانہ نیفتم، مگر قفس چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

اپنے اعزازِ نفس کا اظہار ہے۔ یعنی عزّت کے ساتھ مجھے قید کرو، تو مجھے قید ہونے سے کچھ انکار نہیں ہے۔ پس یہ امید نہ رکھو کہ میں دانے کی لالچ سے جال میں آ پھنسوں گا، نہیں، بلکہ قفس کو اتنا اونچا کرو کہ میرے گھو نسلے تک پہنچ جائے، میں قفس میں فوراً چلا آؤں گا۔

عاشقانہ

تیرِ نخست را غلط انداز گفتہ ام ۔ اے وائے اگر نہ تیرِ دگر بر نشاں رسد!

غلط انداز اس تیر کو کہتے ہیں، جو خطا کر کے غیرِ مقصود جگہ جا لگے۔ چوں کہ عشاق معشوق کے تیر کے مشتاق ہوتے ہیں، اس لیے کہتا ہے کہ ایک تیر تو اس کا آ کر لگا ہے، مگر میں اس کو اپنی نحوستِ طالع کے خیال سے غلط انداز سمجھتا ہوں۔ اب اگر دوسرا تیر بھی اسی جگہ آ کر لگا، تو میں سمجھوں گا کہ پہلا بھی ارادے سے لگایا گیا تھا، ورنہ میرا خیال جو پہلے تیر کی نسبت تھا، صحیح ہو جائے گا اور امید بالکل باقی نہ رہے گی۔

رندانہ

اُمیدِ غلبہ نیست، بہ کیشِ مغاں درآے ۔ مے گر بہ جزیہ دست نداد ارمغاں رسد

یعنی اگر پارسیوں پر غلبہ اور حکومت حاصل ہونے کی امید نہیں ہے، تو ان کا مذہب اختیار کر لے کیوں کہ اس صورت میں اگر شراب جزیے میں نہ آوے گی، تو ہدیہ اور سوغات میں ضرور آوے گی۔ اس شعر میں گویا یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آتش پرستوں پر غلبہ واستیلا حاصل کرنے کی علّتِ غائی یہی ہے کہ جزیے میں شراب آیا کرے۔ پس جب غلبہ کی امید نہ ہو، تو لاچار کیشِ مغاں اختیار کرنا چاہیے، تاکہ اگر جزیے میں نہیں تو ہدیہ و ارمغان ہی میں شراب وصول ہوا کرے۔

عاشقانہ

جاں بر سرِ مکتوبِ تو از شوق فشاندن
از عہدۂ تحریرِ جوابم بدر آورد

زار نالی

آں کشتیِ بشکستہ ز موجم کہ تباہی　　　　　اگلند در آتش گر از آبم بدر آورد

جب کشتی موج کے تھپیڑوں سے ٹوٹ جاتی ہے، تو اس کے تختوں کو پانی سے نکال کر آگ میں ایندھن کی جگہ جلاتے ہیں۔ اپنے تئیں کہتا ہے کہ میری مثال بھی اسی کشتی کی سی ہے کہ ڈوبنے سے بچا تو آگ میں جھونکا گیا۔

تصوّف

گر جلوۂ رُخِ تو بہ ساغر نہ دیدہ ایم　　　　　چندیں بذوقِ بادہ دل از جا چہ میرود

زار نالی

ہفت آسیا بگردش و ما در میانِ او　　　　　غالب! دگر مپرس کہ بر ما چہ میرود

دنیا

مجو آسودگی گر مردِ راہی، کاندریں وادی　　　　　چو خار از پا برآمد، پا ز داماں برنمی آید

یعنی کسی حالت میں بھی آدمی دنیا کے مخمصوں سے نجات نہیں پا سکتا۔ اگر کانٹا پاؤں سے نکل گیا تو پاؤں دامن میں الجھے گا۔

ترکِ بحثِ حلال

برآ از بزمِ بحث، اے جذبۂ توفیقِ غالبؔ را　　　　　کہ ترکِ سادۂ ما با فقیہاں برنمی آید

ترکِ سادۂ یعنی غالب جو کہ ایک بھولا بھالا ترک ہے۔ یہ ایسی ترکیب ہے جیسے موسائے من اور فرہادِ من یعنی خود میں۔ "با فقیہاں برنمی آید" یعنی مولویوں کی دلیلوں اور حجتوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ "با کسے بر نیامدن" کے معنی ہیں اس سے سر بر اور عہدہ برآ نہ ہونا۔

تصوّف

چشم و دل باختہ ام، دادِ ہنر خواہد داد　　　　　آنکہ چوں من ہمہ دانِ ہمہ بینِ تو شود

یعنی چوں کہ میرے دل نے تجھ کو جانا ہے، جیسا کہ تو ہے، اور میری آنکھ نے تجھ کو دیکھا ہے، جیسا کہ تو ہے، اس لیے دل اور آنکھ دونوں کو کھو بیٹھا ہوں۔ پس میرے اس کام کی داد وہی دے گا، جو میری طرح تیرا ہمہ داں و ہمہ بیں ہوگا
تصوّف

کفر و دیں چیست جز آلایشِ پندارِ وجود　　پاک شو پاک کہ ہم کفرِ تو دینِ تو شود

عاشقانہ

رفتہ بودی دگر از جا بہ سخن سازیِ غیر　　منت از بخت کہ خاموشیِ ما یاد آمد

یعنی تو نے رقیب کی سخن سازی سے پھر دھوکا کھایا تھا، مگر شکر ہے کہ اس کی سخن سازی دیکھ کر ہماری خاموشی تجھ کو یاد آگئی جس سے تجھ کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ سچے عاشق منہ سے کچھ نہیں کہا کرتے۔
عاشقانہ

دوش کز گردشِ بختم گلہ بر روئے تو بود　　چشم سوئے فلک و روی سخن سوئے تو بود

یعنی نصیب کی گردش کا گلہ کرتے وقت آنکھ آسمان کی طرف تھی اور باتیں تجھ سے کر رہا تھا۔ ایک خاص حالت کی تصویر بہت عمدہ لفظوں میں کھینچی ہے۔
عاشقانہ

دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند　　کایں ہمانست کہ پیوستہ در ابروئے تو بود

تصوّف

گر چنیں نازِ تو آمادۂ یغما ماند　　بہ سکندر نہ رسد ہر چہ ز دارا ماند

معشوقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے۔ سکندر سے مراد بادشاہِ فاتح، اور دارا سے بادشاہِ مفتوح۔
تصوّف

ہم بہ سودائے تو خورشید پرستم، آرے　　دل ز مجنون بَرد آہو کہ بہ لیلا ماند

یعنی اگر میں آفتاب کی پرستش کروں، تو وہ بھی درحقیقت تیری ہی پرستش ہے، جیسے مجنوں ہرنوں پر اس لیے فریفتہ تھا کہ ان کی آنکھیں لیلیٰ سے مشابہ تھیں۔

عاشقانہ

شکوۂ دوست ز دشمن نتوانم پوشید　　　گر غمِ ہجر چنیں حوصلہ فرسا ماند

یعنی اگر جدائی کا غم اسی طرح بے صبر کرنے والا رہا، تو دوست کا شکوہ ضبط نہ کیا جا سکے گا یہاں تک کہ اس کو دشمنوں سے بھی نہ چھپا سکوں گا۔

مُصیبت

در بغل دشنہ نہاں ساختہ غالبؔ امروز　　　مگذارید کہ ماتم زدہ تنہا ماند

تصوّف

بستندہ جرعۂ آبے بہ سکندر　　　دریوزہ گرِ میکدہ صہبا بہ کدو بُرد

یعنی سکندر کو ایک بے حقیقت پانی کے گھونٹ سے محروم رکھا اور مے کدے کا فقیر شراب جیسی نایاب چیز کا تونبا بھر کرلے گیا۔ مطلب یہ کہ بادشاہوں کو وہ دولت نصیب نہیں جو مے کدے یعنی خانقاہ کے ادنیٰ گداؤں کو نصیب ہے۔

تصوّف

یک گریہ پس از ضبطِ دو صد گریہ رضا دِہ　　　تا تلخیِ آں زہر توانم بہ گلو بُرد

یعنی جب دو سو دفعہ رونے کو ضبط کروں، تو ایک دفعہ تو رونے کی اجازت دے، تاکہ اس ضبط کے زہر کی کڑواہٹ ایک دفعہ رو کر حلق سے دور کردوں۔

عاشقانہ

ز جوشِ شکوۂ بیدادِ دوست می ترسم　　　مباد مہرِ سکوت از دہن فرو ریزد

ایک معقول بات کو محسوسات کے لباس میں ظاہر کرتا ہے۔ مطلب تو یہ ہے کہ اس کے شکوے سے اس قدر بھرا ہوا ہوں کہ شاید اس کو ضبط نہ کرسکوں، مگر اس کو اس طرح

بیان کرتا ہے کہ اس کی بیداد کا شکوہ دل سے اس جوش کے ساتھ اُبلا ہے کہ منہ پر جو مہرِ سکوت لگی ہوئی ہے، کہیں اس کے ریلے میں بہ نہ جائے۔

جفاکشی

بریدہ ام رہِ دوری کہ گر بیفشانم بجائے گرد، رواں از بدن فروریزد

یعنی میں نے ایسی راہِ دراز طے کی ہے کہ اگر بدن کو جھاڑوں تو گرد کی جگہ جان بدن سے جھڑ جائے۔ یہ تمثیل ہے اس محنت و مشقت کی جو فکرِ شعر اور تکمیلِ فنِ سخن میں قائل نے کی ہے۔

عاشقانہ

مکن بہ پرسشم از شکوہ منع کایں خونیست کہ خود ز زخمِ دمِ دوختن فروریزد

عجیب و غریب تشبیہ اور نہایت عمدہ خیال ہے، اور نرا خیال ہی نہیں، بلکہ نیچرل ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب معشوق مہربان ہو کر عاشق کی پرسشِ حال کرتا ہے تو اس وقت عاشقِ مہجور کا دل بھر آتا ہے اور وہ شکایت کرنی شروع کرتا ہے۔ پس کہتا ہے کہ تو میری پرسشِ حال کے وقت شکایت سے مجھ کو منع نہ کر کیوں کہ تو جو پرسشِ حال کرتا ہے تو گویا میرے زخم میں ٹانکے لگاتا ہے، اور ٹانکے لگاتے وقت کسی قدر خون کا ٹپکنا ضروری ہے۔ پس یہ شکایت وہ خون ہے، جو زخم کے سیتے وقت ٹپکا کرتا ہے۔

سفر

اگر بہ دل نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گذرد!

یعنی عمر کا سفر میں گزرنا نہایت عمدہ ہے، بشرطیکہ سفر میں جو کچھ نظر سے گزرے، اس پر انسان فریفتہ نہ ہو جایا کرے۔

عاشقانہ

بوصل لطف بہ اندازۂ تحمل کن کہ مرگِ تشنہ بود آب چوں ز سر گذرد

کہتا ہے کہ وصل کی حالت میں مہربانی اس قدر زیادہ نہ کر کہ میں اس کی خوشی کا تحمل نہ کر سکوں اور خوشی کے مارے مر جاؤں، کیوں کہ پیاسے کے لیے وہ پانی موت ہے، جو سر سے گزر جائے۔

تصوف

ہر کجا دشنۂ شوقِ تو جراحت بارد　　جز خراشے بہ جگر گوشۂ ادہم نرسد
طوبیٰ فیضِ تو ہر جا گل و بار افشاند　　جز نسیمے بہ پرستش گہِ مریم نرسد

جگر گوشۂ ادہم یعنی ابراہیم بن ادہم، کو ان زخموں سے جو تیرے شوق کی چھری برساتی ہے، ایک خراش سے زیادہ نہیں پہنچی، اور جو پھول اور پھل تیرے فیض کے طوبیٰ سے جھڑتے ہیں، ان میں سے صرف ایک ہوا کا جھونکا محرابِ مریم تک پہنچا ہے۔

شوخی

مے بہ زہاد مکن عرض کہ ایں جوہرِ ناب　　پیشِ ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نرسد
خواجہ فردوس بہ میراث تمنا دارد　　وائے گر در روشِ نسل بہ آدم نرسد

خواجہ کا لفظ فارسی میں اکثر ایسے مقام پر بولتے ہیں جیسے طنز کے مقام پر اردو میں تیسرے شخص کے لیے آپ یا حضرت بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ آپ آدم کی میراث میں فردوس کے طلب گار ہیں، بڑا مزا ہو، اگر آپ کا سلسلۂ نسب آدم تک نہ پہنچے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کے اخلاق و عادات انسانیت سے اس قدر بعید ہیں کہ ممکن ہے، آدم کی نسل سے نہ ہوں۔

تصوف

جان در غمت فشاندن لمرگ از قفا ندارد　　تن در بلا فگندن بیمِ بلا ندارد

عاشقانہ

چوں لعلِ تست غنچہ، اما سخن نداند　　چوں چشمِ تست نرگس، اما حیا ندارد

نایابی دوا

فارغ کسیکہ دل ہا یا درد واگزارد — کشتِ جہاں سراسر دارد، گیا ندارد

شوخی

باید زمے ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند — آرے، دروغِ مصلحت آمیز گفتہ اند

تصوّف

گو فنا تا ہمہ آلایشِ پندار بَرَد — از صُوَر جلوہ واز آئینہ زنگار بَرَد

ستمِ لطف نما

عشوۂ رحمتِ چرخ مخر کایں عیّار — یوسف از چاہ برآرد کہ بہ بازار بَرَد

عشوہ خریدن: دھوکا کھانا اور فریب میں آجانا۔ یعنی آسمان کی مہربانی کے دھوکے میں نہ آنا کہ یہ عیّار یوسف کو چاہ سے اس لیے نکالتا ہے کہ بازار میں لے جاکر بیچ لے۔

تصوّف

ہر شمیمے را مشامے درخور است — بوے پیراہن بکنعاں می رود

زار نالی

جوہرِ طبعم درخشانست، لیک — روزم اندر ابر پنہاں می رود
نومیدیِ ما گردشِ ایام ندارد — روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

بیقراریِ شوق

بلبل بہ چمن بنگر و پروانہ بہ محفل — شوق است کہ در وصل ہم آرام ندارد

یعنی شوق کو وصل میں بھی آرام نصیب نہیں، اسی لیے نہ بلبل کو چمن میں آرام ہے اور نہ پروانے کو شمع کی موجودگی میں قرار ہے۔

سخن پُر درد

چہ خیزد از سخنے کز دردِ جان نہ بود — بریدہ بود زبانے کہ خونچکان نہ بود

کہتا ہے کہ جو بات دل سے نہیں نکلتی، وہ کچھ اثر نہیں کرتی۔ پس کیٹو وہ زبان ہے، جو خونچکان یعنی دردِ دل سے بھری ہوئی نہ ہو۔

قسمت

حکیم ساقی و مے تند و من زبد خوئی　　　ز رطلِ بادہ بخشم آیم ار گراں نہ بود

حکیم سے مراد خدا ہے۔ کہتا ہے کہ ساقی تو اندازے سے زیادہ نہیں دیتا اور شراب یعنی دولتِ دنیا نہایت تند ہے، مگر میں اپنی بد خوئی اور زیادہ طلبی سے شراب کا پیالہ ہلکا پاتا ہوں، تو غصے ہوتا ہوں۔

تصوف

ز خویش رفتہ ام و فرصتے طمع دارم　　　کہ باز گردم و جز دوست ارمغاں نہ بود

قاعدہ ہے کہ آدمی جب کہیں سفر کو جاتا ہے، تو وہاں سے کچھ سوغات و ہدیہ و ارمغان لے کر وطن میں واپس آتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں اپنے آپے سے تو جا چکا ہوں، اب یہ چاہتا ہوں کہ واپس پھر کر اپنے آپے میں آؤں، تو دوست یعنی حق کے سوا کوئی سوغات لے کر نہ آؤں۔

تصرفِ شوق

زمامِ ناقہ بدستِ تصرفِ شوق است　　　بسوئے قیس گرایش ز ساربان نہ بود

یعنی لیلیٰ کا ناقہ جو قیس کی طرف چلا ہے، یہ ساربان کی طرف سے نہیں ہے، بلکہ اس وقت اس کی باگ تصرفِ شوقِ قیس کے ہاتھ میں ہے؛ وہ جدھر چاہتا ہے، لے جاتا ہے۔

عاشقانہ

بتانِ شہر ستم پیشہ شہر یار انند　　　کہ در ستم روشِ آموزِ روزگار انند
برند دل بادائے کہ کس گماں نہ برد　　　فغاں ز پردہ نشیناں کہ پردہ دار انند

نہ زرع و کشت شناسند نے حدیقہ و باغ   زبہر بادہ ہوا خواہِ باد و باراند

یعنی ہوا اور مینہ کچھ اسی لیے نہیں چاہتے کہ اس سے کھیتیاں اور باغ سرسبز و شاداب ہوں گے بلکہ صرف اس لیے کہ شراب پینے کا لطف بغیر باد و باراں کے نہیں آئے گا۔

یہ مضمون مرزا کو کہیں تلاش کرنا نہیں پڑا، بلکہ یہ خاص ان کی طبیعت کا اقتضا تھا۔ جس مکان میں مرزا رہتے تھے اس کے دروازے پر ایک کمرہ تھا اور کمرے کے آگے برآمدہ تھا جس کے نیچے رستہ چلتا تھا۔ یہ برآمدہ گزرگاہ سے تقریباً چار گز اونچا ہوگا۔ ایک روز مینہ برس رہا تھا اور مرزا صاحب برآمدے میں بیٹھے ہوئے ابر و باراں کی مدارات میں مصروف تھے۔ اس وقت عالمِ سرخوشی میں فرمانے لگے کہ جی چاہتا ہے، ایسا برسے کہ گلی کی رَو کا پانی برآمدے تک آجائے اور میں یہیں بیٹھا بیٹھا گلاس بھر بھر کر پانی پیوں۔ کسی نے کہا: حضرت! برآمدے تک پانی آگیا تو شہر پہلے ڈوب جائے گا۔ مرزا ہنس کر چپ ہو رہے۔

لذتِ سعی

چہ لطفِ رہروی آنرا کہ خارِ خاری نیست   مرو بکعبہ اگر راہ ایمنی دارد

خار خار، خلجان۔ کہتا ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہ ہو، سفر میں کچھ لطف نہیں۔ پس اگر کعبے کی راہ پُرامن ہے، تو کعبہ جانا نہیں چاہیے۔ فی الحقیقۃ جو لوگ نہایت کٹھن منزلیں طے کر کے مقامِ مقصود تک پہنچتے تھے، جو خوشی ان کو منزل پر پہنچنے سے ہوتی ہو گی، اُس کا سواں حصہ بھی اُن لوگوں کو حاصل نہیں ہوتی، جو ریل اور اسٹیمر میں آج کل سفر کرتے ہیں۔

ناشناسائی ابنائے زماں

بیاوریدگر ایں جا بود زباں دانے   غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

حد سے زیادہ بلیغ شعر ہے۔ اگرچہ مضمون عام ہے مگر خود شاعر کے حال پر خوب چسپاں

ہوتا ہے اور اس نے یقیناً اپنی ہی نسبت کہا ہے۔ جب کوئی غیر ملک کا مسافر شہر میں وارد ہوتا ہے اور اس کی زبان کوئی نہیں سمجھتا تو ترجمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر کچھ تو اس لیے کہ کسی کو اپنا قدر دان اور پایہ شناس نہیں پاتا اور کچھ اس لیے کہ اپنے نازک اور باریک خیالات کا سمجھنے والا کسی کو نہیں دیکھتا اپنے تئیں غریبِ شہر، یعنی شہر میں بالکل اجنبی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی ترجمان کو بلاؤ کہ اجنبی مسافر کچھ باتیں، جو کہنے ہی کے لائق ہیں، کہنی چاہتا ہے

عاشقانہ

پیشم ازاں بپرس کہ پرسی وہاں کوئے — گو بینمت زحمتِ خود زیں دیار برد
نازم فریبِ صلح کہ غالب زکوئے تو — ناکام رفت و خاطرِ امیدوار برد

رندانہ

ہر گر ارخت نمازے نبود از نمِ مے — جائے در حلقۂ رندانِ قدح نوش مباد

جامہ یا رخت کا نمازی نہ ہونا اس کے آلودہ ہونے کو کہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

رندانہ

مغتیاں! بادہ عزیز است، مریزید بخاک — جوشد از پردہ دگر خونِ سیاوش، مباد

دوسرے مصرع کی تقدیرِ عبارت یوں ہے: مباد خونِ سیاوش، دیگر از پردہ بجوشد
سیاوش کا قصہ مشہور ہے کہ وہ بے گناہ اپنے سسرے افراسیاب کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، اور اس کے خون کے دبال میں تمام ملک کشت و خون میں مبتلا رہا۔ کہتا ہے کہ اے مغتیو! شراب بھی بڑی عزیز چیز ہے، اس کو زمین پر مت گراؤ، ایسا نہ ہو کہ خونِ سیاوش پھر جوش مارے۔

شکایتِ چرخ

از رشک کرد آنچہ بہ من روزگار کرد — در خستگی نشاطِ مرادید، خوار کرد

یہ غزل غالباً اس زمانے میں لکھی گئی ہے جب مرزا عدالت کے مواخذے میں پھنس گئے تھے۔ یعنی زمانے نے جب مجھ کو دیکھا کہ خستگی اور تکلیف میں بھی خوش ہے، تو مجھے ذلیل و خوار کر دیا کہ اب تو خوش نہ رہے گا۔

شکوۂ چرخ

در دل ہمی ز بینشِ من کینہ داشت چرخ چوں دید کاں نماند نماں، آشکار کرد

یعنی میری دانش و بینش کے سبب مجھ سے آسمان پوشیدہ کینہ تو رکھتا ہی تھا، اب جو دیکھا کہ وہ کینہ لوگوں پر ظاہر ہو گیا ہے، تو آسمان کھل کھیلا اور علانیہ دشمنی کرنے لگا۔

تقدیر

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست موج دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد

یعنی جو کچھ ہوا وہ میری نادانی سے نہیں، بلکہ قضا و قدر کے حکم سے ہوا۔

شوخی

نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ ئی بکفر نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

ماحصل شعر کا یہ ہے کہ در حقیقت میں ہوں تو نا اُمید، مگر چوں کہ تجھ سے ہے، اور تو کفر سے راضی نہیں، اس لیے مجبوراً اپنے تئیں امیدوار بنایا ہے۔

تصوف

بشرع آویز و حق میجو، ز مجنوں کم نہ ئی بارے دلش با محمل است، اما زباں با ساربان دارد

یعنی شرع سے بھی تعلق رکھ اور خدا کو بھی ڈھونڈھ؛ آخر تو مجنوں سے کم نہیں ہے کہ اُس کا دل تو محمل میں اٹکا ہوا ہے، مگر زبان کو ساربان سے سروکار ہے۔ یعنی ساربان سے باتیں کر رہا ہے اور دل لیلیٰ سے لگا ہوا ہے۔ شرع کو ساربان سے اور حق کو محمل سے تمثیل دی ہے اور نہایت بلیغ تمثیل ہے اور شعر تو

نوادر افکار سے ہے۔

عاشقانہ

خدارا! وقتِ پرسش نیست، بگفتم بگذر از غالب
کہ ہم جاں برلب و ہم داستان ہا بر زباں دارد

"گفتم" یعنی میں نے کہہ دیا ہے یا میں کہے دیتا ہوں کہ یہ پرسش کا وقت نہیں ہے، تو غالب کے حال سے درگزر اور پرسش کا خیال چھوڑ دے کیوں کہ اس کی جان لبوں پر ہے اور داستان زبان پر، مبادا وہ اپنی درد انگیز داستان بیان کرے اور داستان کے ساتھ ہی اس کی جان بھی نکل جائے۔

گویند صنعاں توبہ کرد از کفر، ناداں بندۂ
کز خود فروشیہای دیں بخشش ز یزداں خوش نکرد

صنعان کا قصہ مشہور ہے، جو پہلے عابد تھا، پھر فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا۔ یہاں تک کہ کفر تک نوبت پہنچ گئی۔ پھر متنبہ ہوا اور کفر سے توبہ کی۔ کہتا ہے کہ صنعان کا کفر سے توبہ کرنا مشہور ہے، وہ عجب نادان بندہ ہے جس نے دین کی خود فروشی کے سبب خدا کی بخشش کو پسند نہ کیا، یعنی خدا کی خالص بخشش تو وہ تھی کہ وہ توبہ نہ کرتا، اور کفر ہی پر مرتا، اور پھر خدا اس کو بخش دیتا۔ اور اب جو وہ بخشا جائے گا، تو یہ بخشش دین کی قیمت ہو گی۔ پس گویا اس نے دین کی خود فروشی کے بھروسے پر خدا کی خالص بخشش کو پسند نہ کیا۔ "خوش کردن" کے معنی ہیں پسند کرنا۔

عاشقانہ

آں خود بہ بازی می بَرد، دیں یاد و جومی نشمرد
بنمودمش دیں، خندہ زد، آوردمش جاں، خوش نکرد

شوخی

بامن میاویز اے پدر! فرزندِ آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد

"میاویز" یعنی مجھ سے جھگڑا مت کر۔ "فرزندِ آزر" ابراہیم علیہ السّلام۔ باقی شعر کے معنی

ظاہر ہیں۔ یہ نرا مضمون ہی نہیں ہے، بلکہ مرزا کے حسبِ حال بھی ہے، کیوں کہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے، مرزا کے والد سنی المذہب اور خود مرزا اثنا عشری تھے۔

شوخی

در ستم حق ناشناسش گفتن از انصاف نیست | آں کہ چندیں تکیہ بر حلمِ خداوندش بود

کہتا ہے کہ اس ظالم کو حق ناشناس کہنا انصاف نہیں ہے جس کو خدا کے حلم پر اس قدر بھروسا ہے کہ اس کے بھروسے پر ظلم کیے چلا جاتا ہے اور اس کے مواخذے سے نہیں ڈرتا۔

اخلاق

با خرد گفتم: نشانِ اہلِ معنی باز گوے | گفت: گفتارے کہ با کردار پیوندش بود

بہرِ خواری بسکہ سرگرمِ تلاشم کردہ اند | پارۂ نزدیک در ہر دورباشم کردہ اند

"دورباش" ہٹو بچو کی آواز کو کہتے ہیں، جو بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے نقیب پکارتے چلتے ہیں۔ کہتا ہے کہ مجھ کو جو قضا نے سرگرمِ تلاش کیا ہے، اس سے مقصود میرا خوار و ذلیل کرنا ہے۔ پس راہِ تلاش میں جو دھتکار مجھ پر پڑتی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ میری ذلت و خواری زیادہ ہوتی ہے اور اس طرح جو امر میرے سرگرمِ تلاش کرنے سے مقصود ہے، وہ حاصل ہوتا ہے۔ پس گویا ہر "دورباش" پر میں کسی قدر مقصود کے نزدیک ہوتا جاتا ہوں۔

زارنالی

چرخ ہر روزم غمِ فردا بخوردن می دہد | تا قیامت فارغ از فکرِ معاشم کردہ اند

منقبت

از چہ غالب خواجگیہاے جہاں ننگِ منست | گر نہ با سلمان و بوذر خواجہ تاشم کردہ اند

عاشقانہ

بخشمم ناسزا می گوید و از لطفِ گفتارش | گماں دارم کہ حرفِ دلنشینی بعد ازیں گوید

"لطفِ گفتار" کی تعریف اس سے بہتر کسی پیرایے میں نہیں ہو سکتی۔ کہتا ہے کہ معشوق غصّے میں برابر مجھ کو بُرا بھلا کہتا ہے، مگر اس کے لطفِ کلام سے میں ہمیشہ اسی امید میں رہتا ہوں کہ اب کوئی اچھی بات کہتا ہے، اب کوئی مہربانی کا کلمہ اس کی زبان سے نکلتا ہے۔

دل از پہلو بروں آرد جمش جامِ خود انگارد دگر لختے برافشانم، سلیمانش نگیں گوید

اپنے دل پر فخر کرتا ہے کہ اگر اس کو پہلو سے نکال کر دکھاؤں، تو جمشید اس کو اپنا جامِ جہاں بیں سمجھے؛ اور اگر اس کا ایک لختہ نکال کر ڈال دوں، تو سلیمان اس کو خاتمِ سلیمانی کا نگیں بتائے۔

عاشقانہ

من بہ وفا مُردم و رقیب بَدَر زد نیمہ لبش انگبین و نیمہ تبرزد

"بَدَر زد" یعنی نکل بھاگا۔ "تبرزد" مصری۔ کہتا ہے کہ میں تو نباہ کرتا کرتا مرگیا، اور رقیب نکل بھاگا۔ گویا معشوق کا آدھا لب شہد تھا کہ میں اس میں پھنس کر رہ گیا اور آدھا مصری تھا کہ رقیب اُس پر سے اُڑ گیا۔

عاشقانہ

دعویِ او را بود دلیل بدیہی خندۂ دنداں نما بجبنِ گہر زد

کتنے بڑے خیال کو کن مختصر لفظوں میں اور پھر کس صفائی اور خوبی سے ادا کیا ہے۔ کہتا ہے کہ معشوق موتی پر اس طرح ہنسا کہ اس کے دانت نظر آنے لگے۔ پس اس کا خندہ گویا اس بات کا دعویٰ ہے کہ موتی کی کچھ حقیقت میرے دانتوں کے سامنے نہیں اور اس دعوی کی دلیل اس کا خندۂ دنداں نما ہے کیوں کہ اس کے دانتوں کا سب پر ظاہر ہو جانا یہی اس بات کی دلیل ہے کہ موتی اس کے دانتوں کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ پس اس کے دعوے کی دلیل نہایت بدیہی اور ظاہر ہے

شکوۂ چرخ

نہم جبیں بدرش آستاں بگرداند ‏ ‏ نشیمنش بہ سرِ رہ عناں بگرداند

آستاں بگرداند یعنی چوکھٹ کے پتھر کو اُلٹ کر اوپر کا رُخ نیچے اور نیچے کا رُخ اوپر کر دیتا ہے۔

امتحانِ الٰہی

تونالی از خلۂ خار و تنگری کہ سپہر ‏ ‏ سرِ حسینِ علی بر سناں بگرداند

برو، بہ شادی و اندوہ دل منہ کہ قضا ‏ ‏ چو قرعہ بر نمطِ امتحاں بگرداند

یزید را بہ بساطِ خلیفہ بنشاند ‏ ‏ کلیم را بہ لباسِ شباں بگرداند

تصوف

تیغت ز فرق تا بہ گلویم رسیدہ باد ‏ ‏ شوخی ز حد گذشت، زبانم بریدہ باد

اوّل یہ آرزو کرتا ہے کہ تیری تلوار میرے سر پر پڑے اور حلق تک اتر جائے۔ پھر یہ سمجھ کر کہ یہ مرتبہ ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتا، کہتا ہے کہ گستاخی حد سے گزر گئی، میری زباں قلم ہو جیو۔

عاشقانہ

گر رفتہ ام ز کوے تو، آساں نہ رفتہ ام ‏ ‏ ایں قصہ از زبانِ عزیزاں شنیدہ باد

ذوقیست ہمدمی بفغاں، بگذرم ز رشک ‏ ‏ خارِ رہت بپاے عزیزاں خلیدہ باد

یعنی اگرچہ تیرے عشق میں کسی دوسرے کی شرکت گوارا نہیں، مگر چونکہ کئی آدمیوں کے مل کر نالہ و فریاد کرنے میں عجب لطف ہے، اس لیے میں رشک سے قطع نظر کرتا ہوں اور کہتا ہوں: خارِ رہت بپاے عزیزاں خلیدہ باد

عاشقانہ

در تیغ زدن منتِ بسیار نہادند ‏ ‏ بُردند سر از دوش و سبکدوش نکردند

یعنی تلوار سے سر اتار کر بھی معشوق نے سبکدوش نہ کیا، پہلے سر کا بوجھ تھا اب اس احسان کا بوجھ ہے کہ اپنی تلوار سے یہ بے قدر سر اتارا ہے۔

وصف مے و نے

روزے کہ بہ مے زور و بہ نے شور نہفتند — اندیشہ بکارِ خرد و ہوش نکردند

یعنی شراب کا نشہ اور نے کی آواز کا درد، دونوں عقل و ہوش کے دشمن ہیں پس جب کارکنانِ قضا و قدر نے شراب میں زور اور نے میں شور ودیعت کیا تھا، اس وقت عقل و ہوش کے انجام کا کچھ خیال نہیں کیا۔

تصوف

تاجرِ شوق دراں رہ بتجارت نہ رود — کہ رہ انجامد و سرمایہ بغارت نہ رود

یعنی شوقِ الٰہی کا تاجر اس رستے سے نہیں چلتا کہ جو رستہ چلتے چلتے ختم ہو جائے اور اس رستے میں سرمایہ لوٹا نہ جائے۔

تصوف

رمز شناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد — محرم آن ست کہ رہ جز باشارت نرود

کہتا ہے کہ ہر نکتہ یعنی ہر چیز کی رمز کو سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ محرمِ راز وہی شخص ہے، جو بغیر اُدھر کے اشارے کے ایک قدم نہیں اٹھاتا۔ یعنی جو کچھ نیچر سکھاتی ہے اس کے موافق عمل کرتا ہے۔ کھانے میں، پینے میں، سونے میں، جاگنے میں، غرض کہ ہر کام اور ہر چیز میں نیچر کی ہدایت کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔

شوخی

زاہد از حورِ بہشتی بجز ایں نشناسد — کہ شود دست زدِ شوق و بکارت نرود

دست زدِ شوق ہونا یعنی شوق کے زیرِ مشق ہونا۔ خلاصہ مطلب یہ کہ زاہد شریعت کے تمام الفاظ سے ان کے حقیقی معنی مراد لیتا ہے اور کسی بات کو تمثیل و استعارہ

کنایہ پر محمول نہیں کرتا۔

عاشقانہ

بیا و جوشِ تمنائے دیدنم بنگر — چو اشک از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر

کہتا ہے کہ آ، اور دیدار کی تمنا جو میرے دل میں جوش مار رہی ہے اس کو دیکھ؛ اور پلکوں کے رستے سے آنسو کی طرح میرا ٹپکنا ملاحظہ کر۔ جوشِ تمنائے دیدار کی تصویر اس سے بہتر غالباً کسی نے نہ کھینچی ہوگی کہ "میں آنسو کی طرح پلکوں کے رستے سے ٹپکا جاتا ہوں"۔

تعلّی

زمن بجرمِ طپیدن کنارہ می کردی — بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

تصوف

دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد — در انتظارِ ہما دام چیدنم بنگر

کہتا ہے کہ ہما کے انتظار میں میرا دام بچھانا تو دیکھو۔ جو دانہ جال کے نیچے ہما کے پھنسانے کے لیے ڈالا تھا، وہ اُگا اور بڑھا اور یہاں تک بڑھا کہ اس میں گھونسلے بن گئے، مگر ہما ہی دام میں نہ آیا۔

غزل مسلسل عاشقانہ و رندانہ

اے ذوقِ نواسنجی! بازم بخروش آور — غوغائے شبیخونے بر بنگہِ ہوش آور

گر خود بجہد از سر، از دیدہ فرو بارم — دل خون کن و آن خون را در سینہ بجوش آور

ہاں ہمدمِ فرزانہ! دانی رہِ ویرانہ — شمعے کہ نخواہد شد از باد خموش، آور

ویرانہ یعنی غریب خانہ۔ جو شمع کہ ہوا سے نہ بجھے گی یعنی شراب۔

شورابۂ این وادی تلخ ست اگر دانی — از شہر بسوئے من سرچشمۂ نوش آور

کہتا ہے کہ میں جس وادی میں ہوں، یہاں کا پانی تو تلخ ہے۔ اے ہمدمِ فرزانہ! اگر تو

فیاض ہے تو میرے لیے میرے لیے سرچشمۂ نوش یعنی شراب لا۔

دانم کہ زرے داری اہر جا گزرے داری — مے گر نہ بد سلطان، از بادہ فروش آور

گر مغ بکدو ریزد، برکف نہ و راہی شو — ور شہ بسبو بخشد، بردار و بدوش آور

کہتا ہے کہ تیرے پاس دام بھی ہیں، اور تو سب جگہ آتا جاتا بھی ہے، اگر بادشاہ عطا کرے تو فبہا، ورنہ بادہ فروش سے لا۔ اگر مغ (آتش پرست) یعنی بادہ فروش تونبے میں ڈال دے، تو تونبا ہاتھ پر رکھ اور چل دے۔ اور جو بادشاہ گھڑا بھر عنایت کرے تو کندھے پر اٹھا اور لے آ۔

ریحاں دمد از مینا، رامش چکد از قلقل — آں در رہ چشم افگن، ایں از پے گوش آور

رامش، راگ۔ آں سے مراد ریحاں اور ایں سے مراد قلقل

گاہے بسبکدستی، از بادہ ز خویشم بر — گاہے بسیہ مستی، از نغمہ بہ ہوش آور

گاہے بسبکدستی، یعنی کبھی جلدی سے مجھ کو شراب پلا کر مدہوش کر دے اور پھر جب میں مست ہو جاؤں تو مجھ کو گانا سنا کر ہوشیار کر۔

غالب کہ بقالیش باد، ہمپائے تو گر ناید — بارے غزلے، فردے زاں موینہ پوش آور

ہمپائے تو یعنی ہمراہِ تو۔ موینہ پوش، اونی کپڑے پہننے والا۔ مرزا جاڑے میں روئی دار کپڑا نہیں پہنتے تھے، اکثر اونی یا پشمینے کا چغہ کوٹ اور ٹوپی وغیرہ پہنتے تھے

عاشقانہ

یقینِ عشق کن واز سرِ گماں برخیز — بہ آشتی بنشیں، یا بہ امتحاں برخیز

تصوف

چرا بہ سنگ و گیاہ پیچی اے زبانۂ طور را — زراہِ دیدۂ بیدل در رو و زجاں برخیز

زبانہ، شعلہ۔ وہ تجلّی جو سنگ و گیاہ یعنی کوہِ طور اور نخلِ ایمن پر ظاہر ہوئی تھی۔ اس کی طرف خطاب کرتا ہے کہ اے شعلۂ طور! پتھر اور درخت سے جو کہ تیرے

قابل نہیں ہیں، کیوں پٹتا ہے؟ ہماری آنکھ کی راہ سے دل میں اتر اور جان سے بھڑک اُٹھ۔

عاشقانہ

عیادت است نہ پرخاش، تند خوئی چیست؟   بیا و غمزدہ بنشین ولب گزاں برخیز

معشوق عیادت کو آیا اور عاشق کا حال نہایت سقیم دیکھ کر بے لطف ہوا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ تو عیادت کے لیے آیا ہے، لڑائی کے لیے نہیں آیا۔ پھر یہ تند خوئی اور بدمزاجی کیسی ہے؟ یہاں آ کر بے لطفی کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ پس آ اور مغموم بیٹھ، اور ہونٹ کاٹتا ہوا اٹھ۔

اخلاق

نفس چوں زبوں گردد، دیو را بفرماں گیر   محرمِ سلیمانم، نقشِ خاتم از من پرس

کہتا ہے کہ جب نفس مغلوب ہو گیا، پھر جن کو محکوم کر لینا آسان ہے۔ میں سلیمان کا محرمِ راز ہوں، اس کی انگوٹھی پر یہی نقش کندہ تھا جس سے تمام جن اس کے محکوم تھے۔

رندانہ

بوسہ از لبانم دِہ، عمرِ خضر از من خواہ   جامِ مے بہ پیشم نہ، عشرتِ جم از من پرس

منقبت

وردِ من بود، غالب! یا علی بو طالب!   نیست بخل با طالب، اسمِ اعظم از من پرس

کہتا ہے کہ میرا وظیفہ 'یا علی ابن ابی طالب' ہے، مجھ کو طالبِ صدق سے کچھ بخل نہیں ہے، اسمِ اعظم مجھ سے پوچھ لے کہ یہی "یا علی" اسمِ اعظم ہے۔

عاشقانہ

لطف بتحت ہر نگہِ خشمگیں شناس
آرایشِ جبینِ شکرفان زچیں شناس

اخلاق

بے غمِ نہادِ مردِ گرامی نے شود　　زنہار، قدرِ خاطرِ اندوہگیں شناس!

زنہار کے معنی یہاں ضرور بالضرور کے ہیں۔ یہ لفظ جب نہی پر آتا ہے تو ہرگز کے معنی ہوتے ہیں، اور جب امر پر آتا ہے تو ضرور کے معنی دیتا ہے۔

تصوف

دودِ سودائے تتق بست، آسماں نامیدمش　　دیدہ بر خواب پریشاں زد، جہاں نامیدمش

دنیا و مافیہا کا ہیچ ہونا بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ایک خیالی دھواں اٹھ کر شامیانہ سا بن گیا، ہم نے اس کا نام آسمان رکھ لیا اور آنکھ کو ایک پریشان خواب نظر آیا، اس کو جہاں سمجھ گئے۔ اسی طرح اس کے بعد کے کئی شعروں میں اسی مضمون کی تفصیل ہے مثلاً

تصوف

وہم، خاکے ریخت در چشم، بیاباں دیدمش　　قطرۂ بگداخت، بحرِ بیکراں نامیدمش

باد دامن زد بر آتش، نو بہاراں خواندمش　　داغ گشت آں شعلہ از مستی، خزاں نامیدمش

چوں کہ نو بہار میں تمام جذباتِ نفسانی جوش میں آتے ہیں، اور عشق و ہوس کی تحریک ہوتی ہے، اس لیے بہار کو آگ سے تشبیہ دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہوا نے آگ کو دامن سے سلگایا، میں نے اس کو بہار قرار دے دیا۔ اور جب وہ شعلہ جل بجھا، تو میں نے اس کا خزاں نام رکھ دیا۔

تعریض بہ اہلِ وطن

غربتم ناسازگار آمد، وطن فہمیدمش　　کرد تنگی حلقۂ دام، آشیاں نامیدمش

کہتا ہے کہ جب پردیس میں مجھے تکلیفیں پہنچنے لگیں تو میں اس کو وطن سمجھا، گویا جب دام کے حلقے نے تنگی کی، تو میں اس کو اپنا آشیانہ سمجھ گیا۔ مطلب یہ کہ وطن

میں اس قدر بے مہری اور مغائرت دیکھی تھی کہ جب پردیس مجھ کو راس نہ آیا، تو میں نے اس کو بھی وطن ہی تصور کر لیا۔

عاشقانہ

بود در پہلو بہ تمکینے کہ دل مے گفتمش
رفت از شوخی بآیینے کہ جاں نامیدمش

یہاں بود کی ضمیر معشوق کی طرف راجع ہے۔ کہتا ہے کہ وہ میرے پہلو میں ایسی تمکین کے ساتھ بیٹھا تھا، جس طرح پہلو میں دل رہتا ہے؛ اور وہ شوخی سے اٹھ کر اس طرح چلا گیا کہ میں اس کو جان کہہ اٹھا۔ یعنی جو جان کے جانے سے کیفیت ہوتی ہے، وہی اُس کے جانے سے ہوئی۔

عاشقانہ

دل زبان را راز دانِ آشنائیہا نخواست
گاہ بہماں گفتمش گاہے فلاں نامیدمش ؎

در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم
کعبہ دیدم نقشِ پائے رہرواں نامیدمش

دل در غمش بسوز اگر جاں می دہد عوض
ور جاں دہی غمے، بہ ازاں می دہد عوض

نبود سخن سرائی ما رائگاں کہ دوست
دل می برد زما و زباں می دہد عوض

کہتا ہے کہ یہ سخن سرائی ہم کو مفت نہیں ملی ہے، بلکہ دوست جب دل لے لیتا ہے تو اس کے عوض زبان عنایت کرتا ہے۔ زبان کو دل کا عوض قرار دینے میں شاعر نے لطافت یہ رکھی ہے کہ فی الحقیقت جب تک انسان کہیں دل نہیں دیتا اور عاشق نہیں ہوتا، تب تک زبان میں گرمی اور شعلہ بیانی پیدا نہیں ہو سکتی، خواہ عشقِ مجازی ہو، خواہ عشقِ حقیقی۔

؎ بہماں اور فلاں دونوں مرادف یکدیگر ہیں۔ جب کسی کا نام صراحۃً نہیں لینا ہوتا تو یہاں یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اُردو میں ایسے موقع پر وہ یا وہ شخص یا اِمکا ڈھمکا بولتے ہیں۔

رندانہ

مرا کہ بادہ ندارم، ز روزگار چہ حظ
ترا کہ ہست و نیاشامی، از بہار چہ حظ
خوش است کوثر و پاک است بادہ کر دوست
ازاں رحیقِ مقدس، دریں خمار چہ حظ

تصوّف

چمن پُر از گل و نسرین و دلربائے نیست
بدشتِ فتنہ ازیں گردِ بے سوار چہ حظ

چمن پُر از گل و نسرین سے مراد دنیا ہے، اور دلربا سے مراد وہ ذاتِ بے نشان ہے جو دید و دریافت سے باہر ہے۔ کہتا ہے کہ اس فتنہ خیز دشت یعنی دنیا میں جہاں قدم قدم پر راہزن اور قزاق گھات میں لگے ہوئے ہیں، اس گردِ بے سوار سے کیا مدد پہنچ سکتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب راہ میں مسافر کو خطرہ ہوتا ہے اور اس کی کمک کے لیے کوئی سوار آتا ہے، تو اوّل گرد نظر آتی ہے، پھر سوار نمودار ہوتا ہے، مگر اس دشت میں گرد یعنی آثار و علامات تو سب موجود ہیں، مگر سوار کا کہیں پتہ نہیں۔

تصوّف

چنیں کہ نخل بلند است و سنگ ناپیدا
ز میوہ تا نہ فتد خود ز شاخسار، چہ حظ

یعنی جب کہ نخل اس قدر بلند ہے اور پھل جھاڑنے کے لیے پتھر ناپید ہیں، تو جب تک میوہ خود درخت سے نہ گرے یعنی جب تک جاذبۂ عنایت ہم کو خود اپنی طرف نہ کھینچے اور شاہدِ حقیقی خود اپنی جھلکی نہ دکھائے، ہم کو کیا فائدہ؟

شکایت

نہ مرا دولتِ دنیا، نہ مرا اجرِ جمیل
نہ چو نمرود توانا، نہ شکیبا چو خلیل

فکرِ عقبیٰ

مینہ و باد بہ شبگیر در افگندہ براہ
آنکہ دانست سراسیمگیِ صبحِ رحیل

بُنہ و بار، ساز و سامان۔ شبگیر، پچھلی رات۔ یعنی جو شخص یہ جانتا ہے کہ کوچ کی صبح کو کیسی گھبراہٹ اور کھلبلی پڑتی ہے، وہ رات ہی سے تمام ساز و سامان باندھ جوڑ کر رستے کے سرے پر ڈال دیتا ہے۔

رندانہ

اے بہ ترسا بچگان کردہ مےِ ناب سبیل ۔۔۔ نہ کنی چارہ لبِ خشکِ مسلمانے را

یہ خطاب ہے خدا کی طرف۔ معنی ظاہر ہیں۔

ناقدر دانی

بدیارے کہ نداند نظیری ز قتیل ۔۔۔ غالبِ سوختہ جاں را چہ بگفتار آری

نداند نظیری ز قتیل۔ یعنی نظیری اور قتیل میں فرق نہیں کرتے۔

فخریہ

شمعِ شبستانیم، بادِ سحرگاہیم ۔۔۔ شعلہ چکد، غم کرا؟ گل شگفد، مزد کو؟

اپنی مصیبت اور اپنی فیض رسانی اور اس پر لوگوں کی بے دردی اور ناقدر دانی ظاہر کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں گویا "شمعِ شبستانی" ہوں کہ اس میں سے شعلے جھڑتے ہیں، مگر کسی کو اس کے ساتھ ہمدردی نہیں؛ اور گویا میں بادِ سحرگاہی ہوں، جو پھول کھلاتی ہے، مگر اس کی اُجرت کوئی ادا نہیں کرتا۔

شوخی

زود ز کُو نگذرد کوکبۂ شاہیم ۔۔۔ از صفِ طفلان و سنگ رہ شدہ بر خلق تنگ

یعنی میری شاہانہ سواری کوچے سے نہیں گزرتی کیوں کہ لڑکوں کے ہجوم اور پتھروں کے پتھراؤ سے راہ تنگ ہو جاتی ہے۔

تصوف

گر نہ تواند رسید بخت بہ ہمراہیم ۔۔۔ جذبِ تو باید قوی، کاں ببرد، باک نیست

کہتا ہے کہ تیرا جذبہ قوی چاہیے، جو مجھ کو منزل تک لے جائے۔ پس نصیب اگر میرے ساتھ نہ چل سکے، تو کچھ حرج نہیں۔

تجربہ

غالب نام آورم، نام و نشانم مپرس | ہم اسد اللہم و ہم اسد اللّٰہیم

رندانہ

بر لب یا علی، سرائے، بادہ روانہ کردہ ایم | مشربِ حق گزیدہ ایم، عیشِ مغانہ کردہ ایم

روانہ کردہ ایم یعنی جاری کردہ ایم۔ کہتا ہے کہ چوں کہ لب پر یا علی، جاری ہے، اس لحاظ سے تو ہم نے مذہبِ حق اختیار کیا ہے؛ اور چوں کہ اس پر شراب جاری ہے اس لحاظ سے مغوں یعنی آتش پرستوں کا سا عیش کرتے ہیں۔ یعنی دین و دنیا دونوں ہم کو حاصل ہیں۔

ندامت

بادہ بوام خوردہ و زر بہ قمار باختہ | وہ کہ زہر چہ ناسزاست، ہم بسزا نکردہ ایم

یعنی شراب پینا اور روپیہ ضایع کرنا تو برا تھا ہی، ہم نے ان برائیوں کو بھی خوبی کے ساتھ نہ کیا۔ شراب پی تو قرض کی، اور روپیہ کھویا تو جوئے میں۔

کتمانِ عشق

نالہ بلب شکستہ ایم، داغ بدل نہفتہ ایم | دولتیانِ ممسکیم، زر بخزانہ کردہ ایم

نالہ بلب شکستہ ایم یعنی اس کو منہ سے نہیں نکلنے دیتے اور ضبط کرتے ہیں، اور داغ کو دل میں چھپائے رکھتے ہیں؛ ہم دولت مند تو ہیں مگر خسیس ہیں، اپنی دولت کو خزانے میں رکھتے ہیں۔

تصوف

گر فراموشی بفریادم رسد، وقتست وقت | رفتہ ام از خویشتن، چندانکہ در یادِ خودم

کہتا ہے کہ میں اپنے آپ سے تو گزر گیا ہوں، مگر ابھی آپ کو بھولا نہیں ہوں اگر فراموشی اس وقت میری فریاد کو پہنچے اور آپ کو بھلا بھی دے، تو بہت مناسب ہے۔

تصوف

ہر قدم دُوری منزل ہے نمایاں مجھ سے — ہر قدم لختے ز خود رفتن بود در بارِ من ہمچو شمع بزم در راہِ فنا زادِ خودم

کہتا ہے کہ راہِ فنا میں جو کچھ کہ میرے 'بار' یعنی خورجی یا زنبیل میں ہے، وہ صرف یہی ہے کہ ہر قدم پر تھوڑا تھوڑا اپنے آپ سے دور ہوتا جاتا ہوں۔ گویا جس طرح کہ شمع راہِ فنا میں آپ ہی اپنا زادِ راہ ہے کہ برابر پگھلتی جاتی ہے اور زادِ راہ کی طرح نبڑتی جاتی ہے، اسی طرح میں بھی آپ اپنا زادِ راہ ہوں۔

عاشقانہ

یاد باد آں روزگاراں کا عتبارے داشتم — آہِ آتشناک و چشمِ اشکبارے داشتم

جوانی کے زمانے کو یاد کرتا ہے، جب کہ بوالہوسی یا عشق و محبت زور شور پر تھا، آہ آتش ناک تھی اور آنکھ اشک بار۔

بیخودی

دیگر از خویشم خبر نبود، بہ تکلف بر طرف — ایں قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

عاشقانہ

ایں چہ شور است کہ از شوقِ تو در سر دارم — دلِ پروانہ و تمکینِ سمندر دارم

تصوف

آں چرا در طرب و ایں ز چہ رو در تعب است — خندہ بر غفلتِ درویش و توانگر دارم

کہتا ہے کہ میں درویش و توانگر دونوں کی غفلت پر ہنستا ہوں جب کہ دنیا کا طرب اور تعب دونوں ہیچ ہیں، تو ایک خوش کیوں ہے؟ اور دوسرا رنجیدہ کیوں ہے؟

مناجات

راز دارِ تو و بدنام کُنِ گردشِ چرخ ہم سپاس از تو و ہم شکوہ ز اختر دارم

خدا سے کہتا ہے کہ جو تجھ سے تکلیف پہنچتی ہے اس کی مصلحت کو خوب سمجھتا ہوں، مگر آسمان کو بدنام کرتا ہوں۔ پس در حقیقت تیرا احسان مند ہوں، مگر بظاہر ستارے کا شکوہ گزار۔

عاشقانہ

خوشنودم از تو وز پے دور باشِ خلق آوازۂ جفاے تو در عالم افگنم

کہتا ہے کہ میں نے تجھ کو جفا کار اس لیے مشہور کر رکھا ہے کہ اور کوئی تیری طرف رغبت نہ کرے ورنہ در حقیقت میں تجھ سے ہر طرح راضی اور خوشنود ہوں۔

فقر

دو زند گر بفرض زمیں را بہ آسماں حاشا کزیں فشار در ابرو خم افگنم

افسوس متضمن فخر

ہم بعالم ز اہلِ عالم بر کنار افتادہ ام چوں امام سبحہ بیروں از شمار افتادہ ام

ز من حذر نکنی، اگر لباسِ دیں دارم نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

اس شعر کے مصداق وہ مکار اور ریا کار لوگ ہیں، جن کو متشرع اور مقدس سمجھ کر ان کے آگے کوئی بات ہنسی یا بے تہذیبی یا رندمشربی کی کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر ان کو ذرا ٹٹول کر دیکھیے، تو وہ ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنے والے نکلتے ہیں۔ اس میں خطاب معشوق کی طرف ہے جو نو عمر ہونے کے سبب مقدس آدمیوں کی صحبت سے بھاگتا ہے۔

شکایت

نشستہ ام بگدائی بشاہراہ ہنوز ہزار دُزد بہر گوشہ در کمیں دارم

"ہنوز" کا لفظ یہاں ایسا ہے جیسا اردو میں "تاہم" یا "باوجود اس کے" بولتے ہیں۔
کہتا ہے کہ میں امیروں کی مدح سرائی کے لحاظ سے تو ایسا ہوں، جیسے شاہراہ میں ایک گدا بیٹھا ہو، مگر اس لحاظ سے کہ لوگ میرے مضمون چُراتے ہیں، میرا یہ حال ہے کہ ہزاروں چوٹے میری گھات میں لگے ہوئے ہیں۔

توقع

ز وعدہ دوزخیاں را فزوں نیاز ارند　　　توقع عجب از آہِ آتشیں دارم

کہتا ہے کہ اہلِ دوزخ کو ظاہر ہے کہ میعادِ معیّن سے زیادہ دوزخ میں نہ رکھینگے پس اس خیال سے میں اپنی آہِ آتشیں سے ایک عجیب توقع رکھتا ہوں، یعنی یہ کہ آہِ آتشیں بھی ہمیشہ نہ رہے گی۔ اس توقع کو عجیب اس لیے کہا ہے کہ اس کو بھی دوزخ پر قیاس کر کے اس نے آخرکار نجات کا امید وار ہے۔

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب!　　　خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

دوسرا مصرع نظیری کا ہے جس کا اصل مصرع یہ ہے:

مرا بہ سادہ دلیہائے من تواں بخشید

نظیری کا یہ شعر بڑے رتبے کا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ مرزا نے یہ مصرع تضمین کیا گیا ہے گویا اس کو چھین لیا ہے۔ مرزا کے مقطع کا مطلب اب یہ ہو گیا کہ نظیری کی غزل پر غزل لکھنی تھی تو خطا، مگر میں نے اس پر ایسی غزل لکھی ہے کہ اپنی اس خطا پر آفریں کا امید وار ہوں۔

غزل مسلسل عاشقانہ

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم　　　قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

معشوق سے کہتا ہے کہ تو آ، تاکہ آسمان کا یہ قاعدہ کہ وہ دوست کو دوست سے نہیں ملنے دیتا ہم تم دونوں مل کر پلٹ دیں اور حکمِ قضا کو رطلِ گراں یعنی جامِ شراب

کی گردش سے پھیر دیں۔

بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم | بکوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم

در فراز کنیم یعنی دروازہ بند کر دیں اور چوکیدار کو حکم دیں کہ کوچے میں پھر تا رہے اور کسی کو نہ آنے دے۔

اگر ز شحنہ بود گیر و دار، نندیشم | وگر ز شاہ رسد ارمغاں، بگردانیم

اگر کلیم شود ہمزباں، سخن نہ کنیم | وگر خلیل شود میہماں، بگردانیم

گل افگنیم و گلابے بہ رہگذر پاشیم | مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم | بکار و بار زنے کارداں بگردانیم

گہے بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم | گہے بہ بوسہ زباں در دہاں بگردانیم

لابہ، تملق و خوشامد۔ سخن کو ادا کے ساتھ ملانا: راؤ چاؤ اور راز و نیاز کی باتیں کرنا۔

نہیم شرم بیک سو و باہم آویزیم | بشوخیے کہ رخِ اختراں بگردانیم

ز جوشِ سینہ سحر را نفس فرو بندیم | بلائے گرمیِ روز از جہاں بگردانیم

یعنی اختلاط کے موقع پر ہم دونوں ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا دم بند کر دیں، اور اس کو طلوع نہ ہونے دیں، اور دن کی گرمی کی بلا جہان سے ٹال دیں۔

بوہم شب ہمہ را در غلط بیندازیم | ز نیمہ رہ رمہ را ابا شباں بگردانیم

یعنی سب کو رات کے دھوکے میں ڈال دیں یہاں تک کہ چرواہے کو ریوڑ سمیت آدھے رستے سے شہر کی طرف الٹا پھیر دیں

بجنگ باج ستانانِ شاخساری را | تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم

یعنی جو لوگ درختوں سے میوہ اور خواکہ کی ڈالی لینے کو آئیں، ان کو لڑ کر باغ کے باہر ہی خالی چھال کے ساتھ پھیر دیں۔

بہ صلح بال فشانانِ صبحگاہی را | ز شاخسار سوے آشیاں بگردانیم

یعنی جو پرندے صبح کو گھونسلوں سے درختوں پر آ کر کلیل کرتے ہیں، ان کو نرمی اور چمکار کے ساتھ گھونسلوں کی طرف لوٹا دیں۔

زحیدریم من و تو، زما عجب نہ بود　　　گر آفتاب سوے خاوراں بگردانیم

کہتا ہے کہ ہم تم حیدری ہیں، ہم سے تعجب نہیں کہ جس طرح بقول بعض حیدر کرار سے معجزۂ رد الشمس ہوا تھا، ہم بھی آفتاب کو مشرق کی طرف واپس پھیر دیں۔

ندامت

رفت بر ما آنچہ خود ما خواستیم　　　دایہ از سلطان بہ غوغا خواستیم

قاعدہ ہے کہ جب فقیر بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت شور و غل کرتا ہے، تو اس کو مار کر ہٹا دیتے ہیں اور کچھ نہیں دیتے۔ کہتا ہے کہ ہم پر جو سختی گزری، وہ خود ہم نے ہی چاہی تھی، کیوں کہ بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت شور و غل بہت کیا، اس لیے وہاں سے دھتکارے گئے اور کچھ نہ ملا۔ سلطان سے مراد خدا تعالیٰ ہے۔

فخریہ

دانش و گنجینہ، پنداری، یکے ست　　　حق نہاں داد آں چہ پیدا خواستیم

پنداری اور گویی اور گویا کے ایک معنی ہیں۔ کہتا ہے کہ علم اور خزانہ گویا ایک ہی چیز ہیں، کیوں کہ جو چیز ہم نے علانیہ مانگی یعنی دولت، وہ خدا نے ہم کو پوشیدہ طور پر دی یعنی علم و ہنر۔

تصوف

رفت و باز آمد ہما در دامِ ما　　　باز سر دادیم و عنقا خواستیم

کہتا ہے کہ ہما ہمارے دام میں پھنس کر نکل گیا تھا، پھر آن پھنسا، اب چاہیے تھا کہ اس کی زیادہ نگرانی کرتے اور اس کو نکلنے نہ دیتے، مگر ہم نے اس کو خود چھوڑ دیا اور عنقا کی خواہش کی۔ ہما سے مراد دولتِ دنیا، اور عنقا سے مراد احدیتِ ذات

آزادی

وحشتے در سفر از برگِ سفر داشتہ ایم　　　　توشۂ راہ، ولے بود کہ برداشتہ ایم

فخر متضمن شکوہ

داغِ احسانِ قبولی لئیمانش نیست　　　　نازبر خرمیِ بختِ ہنر داشتہ ایم

قبولی اور قبول ایک معنی میں آتا ہے۔ خرمیِ بختِ ہنر یعنی سرسبزی بخت ہنر۔ کہتا ہے کہ ہم کو اپنے ہنر کی خوش نصیبی پر ناز ہے کیوں کہ اس پر کمینوں کی قبولیت کے احسان کا داغ نہیں ہے۔

فخر متضمن شکایت

زخمِ جگرم بخیہ و مرہم نہ پسندم　　　　موجِ گہرم جنبش و رفتار ندانم

یعنی جس طرح زخم جگر تک بخیہ و مرہم کی رسائی نہیں ہے اور آبِ گہر کی موج میں جنبش و رفتار نہیں ہے، ایسا ہی میرا حال ہے۔ یعنی نہ کسی کو میرے درد کی خبر ہے، نہ میرے کمال کی اطلاع ہے۔

فخر

نقدِ خردم، سکۂ سلطاں نہ پذیرم　　　　جنسِ ہنرم، گرمیِ بازار ندانم

شکر

غالب نبود کو تہی از دوست ہمانا　　　　زانساں دہدم کام کہ بسیار ندانم

یعنی وہ اس طرح حاجت روائی کرتا ہے کہ اکثر مجھ کو شعور نہیں ہوتا کہ کیوں کر یہ کام بن گیا۔

ذیل کی غزل نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا، اُس میں پڑھی گئی تھی۔ چوں کہ دلی کے تمام نامور شعرا کا، جو وہاں فارسی غزلیں لکھ کر لے جاتے تھے، مرزا نے اس غزل میں ذکر کیا ہے اور غزل بھی نہایت فصیح ہے، اس

لیے بطور یادگار کے ساری غزل یہاں نقل کی جاتی ہے۔

عاشقانہ

ہائے پری چہرہ غزالان وز مردم رم شاں ۔۔۔ دلِ مردم بخم طرّہ خم در خم شاں

کافرانند جہاں جوے کہ ہرگز نہ بود ۔۔۔ طرّہ حور دلاویز تر از پرچم شاں

آشکارا کش بدنام و نکو نامی جوے ۔۔۔ آہ ازیں طائفہ وانکس کہ بود محرم شاں

صدق طلب

رشک بر تشنہ تنہا روِ وادی دارم ۔۔۔ نہ بر آسودہ دلانِ حرم و زمزم شاں

اخلاق

بگذر از خستہ دلانے کہ ندانی، ہشدار ۔۔۔ خستگانند کہ دانی و نداری غم شاں

یعنی ان مصیبت زدوں کو جانے دے، جن کو تو نہیں جانتا، مگر خبردار رہ کہ بہت سے ایسے آفت زدہ ہیں جن کو تو جانتا ہے مگر ان کا کچھ غم تجھ کو نہیں۔

بیدردی اطبا

داغِ خوں گرمیِ ایں چارہ گرانم، گویی ۔۔۔ آتش است آتش، اگر پنبہ و گر مرہم شاں

ذکرِ معاصرینِ خود

ایکہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم ۔۔۔ چہ بما منّتِ بسیار نہی از کم شاں

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود ۔۔۔ باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دم شاں

مومن و نیّر و صہبائی و علوی وانگاہ ۔۔۔ حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

غالبِ سوختہ جاں، اگرچہ نیرزد بشمار ۔۔۔ ہست در بزمِ سخن ہمنفس و ہمدمِ شاں

مومن یعنی حکیم مومن خان جن کے دیوان اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود

---

[۱] یعنی زہے پری چہرہ غزالاں [۲] محبت و ہمدردی [۳] یعنی خوش نفساں سخنور انند

ہیں نیر یعنی نواب ضیاءالدین احمد خان رئیسِ لوہارو جن کا کلام دونوں زبانوں میں بقدرِ معتد بہ موجود ہے مگر کوئی دیوان مرتب نہیں ہوا۔ صہبائی یعنی مولانا امام بخش جن کی نظم و نثر فارسی اور دیگر رسائل اور شروح تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ علوی مولانا عبداللہ خان علوی استادِ مولانا صہبائی جن کی نظم و نثر چھپ چکی ہے، اور عربی میں بھی ان کے قصائد موجود ہیں حسرتی، نواب محمد مصطفےٰ خان رئیس جہانگیر آباد جن کے دیوان اُردو و فارسی دونوں زبانوں میں چھپ چکے ہیں اور اس کے سوا سفرنامۂ حج، تذکرۂ گلشنِ بیخار، اور رقعاتِ فارسی بھی اُن کی تصانیف سے شائع ہو چکی ہیں۔ آزردہ، مولانا مفتی محمد صدرالدین خان جن کا کلام اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں موجود تھا، مگر افسوس ہے کہ اس میں سے بہت کچھ ضائع ہو گیا ہے لیکن بعض مذہبی رسالے جواُن سے یادگار رہ گئے ہیں، شائع ہو چکے ہیں۔

فخریہ

تازہ دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن	ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است	شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن
مطربِ از شعرم بہر بزمے کہ خواہد زد نوا	چاک ہا ایثارِ جیبِ پیرہن خواہد شدن
حرف حرفم در مذاقِ فتنہ جا خواہد گرفت	دستگاہِ نازِ شیخ و برہمن خواہد شدن

کہتا ہے کہ میرا ایک ایک حرف مذاقِ فتنہ میں جگہ پائے گا یعنی فتنہ کو پسند آئے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ برہمن اس کو اپنے موافق سمجھے گا اور شیخ اپنے موافق خیال کرے گا، اور دونوں اپنی اپنی جگہ اس پر فخر کریں گے اور ایک دوسرے کو جھٹلائیں گے اور آپس میں گل خپ ہوں گے۔

انجام شاعری

ہی۔ چہ میگویم ہ اگر اینست وضعِ روزگار	دفترِ اشعار بابِ سوختن خواہد شدن

اس سے پہلے بطور فخر کے کہا تھا کہ یوں ہوگا اور دُوں ہوگا؛ پھر کہتا ہے کہ ہے ہے، میں کیا کہتا ہوں ؟ اگر زمانے کا حال ایسا ہی رہا تو دفترِ شعر، بابِ سوختن یعنی جلا دینے کے لائق ہو جائے گا۔

انجامِ شاعری

چشمِ کور آئینۂ دعویٰ بکف خواہد گرفت — دستِ شل مشاطۂ زلفِ سخن خواہد شدن
شاہدِ مضمون کہ اینک شہریِ جان و دلست — روستا آوارہ کام و دہن خواہد شدن

یعنی آئندہ یہ حال ہوگا کہ شاہدِ مضمون جو اب جان و دل کے شہر میں مقام رکھتا ہے، وہ کام و دہن کے دیہات میں آوارہ ہو جائے گا۔ یعنی جن اشعار اور خیالات میں اب نہایت دقیق اور گہری نگاہ سے غور کی جاتی ہے وہ صرف لوگوں کی زبانوں پر رہ جائیں اور ان کی تہ کو کوئی نہ پہنچے گا۔

انجامِ شاعری

زاغ زاغ اندر ہوائے نغمہ بال و پر زناں — ہم نوائے پردہ سنجانِ چمن خواہد شدن

جنگلی کوّے (یعنی تنگ بندی کرنے والے شاعر) نغمہ سنجی کی ہوا میں پنکھ پسارے ہوئے چمن کے نغمہ سنجوں (یعنی عالی درجہ شاعروں کی) برابری کریں گے۔

انجامِ دنیا

شاد باش اے دل! دریں محفل کہ ہر جا نغمہ ایست — شیونِ رنجِ فراقِ جان و تن خواہد شدن

اب کہتا ہے کہ دنیا میں ان باتوں کا فکر کرنا بے سود ہے؛ یہ سب نغمے موزوں ہوں یا ناموزوں، ایک دن موت کے نوحے بن جائیں گے۔

انجامِ دنیا

ہم فروغِ شمعِ ہستی تیرگی خواہد گزید — ہم بساطِ بزمِ مستی پُر شکن خواہد شدن
گردِ پندارِ وجود از رہگذر خواہد نشست — بحرِ توحیدِ عیانی موجزن خواہد شدن

کہتا ہے کہ ہستی کے دھوکے کا غبار جو راہ میں اٹھتا ہوا نظر آتا ہے، یہ سب بیٹھ جائے گا یعنی سب فنا ہو جائیں گے اور توحیدِ عیانی کا دریا موجزن ہوگا۔ یعنی ذاتِ واحد کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔

ترجیح کافر بہ مسلماناں

دولت بغلط نبود از سعی پشیماں شو　　　کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

کہتا ہے کہ دولت یعنی سعادت کبھی غلطی نہیں کرتی؛ وہ اس کے پاس جاتی ہے جو اس کے لائق ہوتا ہے۔ پس تو اے مخاطب! اپنی سعی سے پشیمان ہو اور وہ دولت کیا ہے؟ کافر ہونا۔ کہتا ہے کہ تو کافر نہیں ہو سکتا، لاچار مسلمانی پر قناعت کر۔ غالباً مرزا نے کفر سے وہ کفر مراد لیا ہے، جو صوفیۂ کرام کی اصطلاح کے موافق ایک بڑا رتبہ مراتبِ فقر و درویشی میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن قطع نظر ان معنوں کے، اس شعر کے ایک اور معنی نہایت لطیف و پاکیزہ زمانے کے حسبِ حال بھی ہو سکتے ہیں، جو شاید شعر کہتے وقت مرزا کے خیال میں نہ گزرے ہوں، مگر ضرور ہے کہ انھیں کے نتائجِ افکار میں شمار کیے جائیں کیوں کہ بلغا اکثر کلام کی بنیاد ایسے جامع اور حاوی الفاظ پر رکھتے ہیں کہ گو قائل کا مقصود ایک خاص معنی سے زیادہ نہ ہو مگر کلام اپنی عمومیت کے سبب بہت سے محمل رکھتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا مسلمان ہونا جس کو سارا زمانہ مسلمان کہے اور مسلمان سمجھے، یہ تو بہت آسان ہے، مگر قوم کی بھلائی کی وہ تدبیریں کرنی کہ اس کی بھلائی ان کے بغیر دشوار معلوم ہو اور ان تدبیروں کے اختیار کرنے میں لوگوں کے طعن و تشنیع سے نہ ڈرنا، یہاں تک کہ بد مذہب اور کافر مشہور ہونا، مگر قوم کی خیر اندیشی سے دست کش نہ ہونا نہایت دشوار، بلکہ بعض حالتوں میں قریب ناممکن کے ہے کہ ہزاروں اور لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں ایک ایسا فرد دنیا کے عجائبات میں سمجھا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسا کافر بننا تو بہت مشکل ہے، ناچار مسلمانی

پر اکتفا کرے یہ معنی کسی کے ذہن نشین کرنے نہایت مشکل تھے، مگر الحمدللہ کہ خود ہماری قوم میں حسنِ اتفاق سے اس وقت ایک شخص موجود ہے، جس کی حالت پر نظر کرنے کے بعد اس شعر کے کوئی دوسرے معنی ان معنوں سے زیادہ چسپاں نہیں معلوم ہوتے یعنی ڈاکٹر سر سیّد احمد خان جس نے کافر، ملحد، نیچری، دجّال، سب کچھ کہلوانا منظور کیا مگر قوم کی خیر خواہی سے دست بردار نہ ہوا۔

خطاب بہ ناقصاں

از ہرزہ رواں گشتن قلزم نتواں گشتن   جوئی! بہ خیاباں رَو؛ سیلی، بہ بیاباں شو

ہرزہ یعنی برائے نام جاری ہونے سے قلزم نہیں ہوا جاتا۔ اے مخاطب! تو ایک نالی ہے، باغ کی کیاریوں میں جا؛ اور ایک رَو ہے، جنگل کی راہ لے۔ یہ ان ناقص العیار لوگوں کی طرف خطاب ہے، جو کسی فن میں شُد بُد حاصل کر کے اپنے تئیں کاملین بہ شمار کرنے لگتے ہیں۔

اطاعت

گر چرخ فلک گردی، سر بر خطِ فرماں نہ   ور گوے زمیں باشی، وقفِ خم چوگاں شو

یعنی تو کیسا ہی عالی رتبہ اور گرانمایہ ہو جائے، اطاعت و فرمانبرداری کرنی ضرور ہے چاہو، اطاعت کو عام لو اور چاہو، خاص خدا کی فرماں برداری مراد رکھو کیوں کہ جس طرح دین میں بغیر خدا اور رسول کی فرماں برداری کے کام نہیں چلتا، اسی طرح دنیا میں سلاطین و ملوک اور ماں باپ اور افسر اور آقا وغیرہ کی اطاعت کے بغیر کچھ بن نہیں آتی۔

صبر و شکیب

در بندِ شکیبائی مُردم ز جگر خائی   اے حوصلہ تنگی کن، اے غصہ فراواں شو

کہتا ہے کہ صبر کے شکنجے میں کلیجہ مسوستا مسوستا مر گیا یعنی تھک گیا۔ اب سوا

اس کے اور کسی طرح اس بلا سے چھٹکارا نہیں کہ حوصلہ تنگی کرنے لگے اور غم حد سے بڑھ جائے۔ پس کہتا ہے کہ اے حوصلے! تو جیسا کہ اب تک فراخ اور وسیع رہا ہے، اب برخلاف اس کے تنگ ہو جا؛ اور اے غم تو زیادہ ہو جا، تاکہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکے اور کھل کھیلوں اور جگر خواری کے عذاب سے نجات پاؤں۔

شکایت

سرمایہ کرامت کن وانگاہ بغارت بر　　　　برخرمنِ ما برقے بر مزرعہ یاراں شو

اگرچہ ہوتا ہمیشہ یہی ہے کہ اول سرمایہ دیتے ہیں، پھر جب چاہتے ہیں اس کو تباہ کر دیتے ہیں۔ مگر شاعر بطور مبالغے کے یہ جتاتا ہے کہ ہماری کھیتی پر مینہ تو کبھی نہیں برساتا مگر خرمن پہ بجلی گراتا رہتا ہے۔ یہ انسان کی ایک قدرتی خاصیت ہے کہ مصیبتوں کے وقت نعمتوں کو بالکل فراموش کر دیتا ہے، اسی خاصیت پر شاعر نے شعر کی بنیاد رکھی ہے۔

ذیل کی غزل مُسلسل اور عاشقانہ ہے، جس میں معشوق کی خصلتیں بیان کی ہیں اور اس کو بہادر شاہ کی تعریف اور شکایتِ ظریفانہ پر ختم کیا ہے۔ اس غزل میں صرف حسنِ بیان کا لطف ہے۔ خیالات بلند نہیں ہیں۔

غزل مسلسل عاشقانہ

بتے دارم از اہلِ دل رَم گرفتہ　　　　بشوخی دل از خویشتن ہم گرفتہ

دل گرفتن اکتا جانا یعنی اس قدر شوخ اور نازک مزاج ہے کہ اپنے آپے سے بھی بگڑتا ہے۔

زسفّاک گفتن چو گل بر شگفتہ　　　　دریں شیوہ خود را مسلّم گرفتہ

یعنی اگر کوئی اسے سفّاک کہتا ہے، تو برا نہیں مانتا، بلکہ خوش ہوتا ہے۔ گویا اپنی سفّاکی کو مسلّم الثبوت مانے ہوئے ہے۔

فسوں خواندہ و کارِ عیسیٰ نمودہ　　　پری بودہ و خاتم از جم گرفتہ

یعنی افسوں سے معجزے کا کام لیتا ہے اور پری ہو کر جمشید کی انگوٹھی چھین لیتا ہے۔

دَمش رخنہ در زُہدِ یوسف فگندہ　　　غمش گندم از دستِ آدم گرفتہ

"دَم" سے مراد بات ہے۔ دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ اس کے غم میں آدم کو گندم جیسی چیز فراموش ہو جاتی ہے۔

گہے طعنہ بر لحنِ مطرب سرودہ　　　گہے خردہ بر نطقِ ہمدم گرفتہ

بہ بیداد صد کُشتہ برہم نہادہ　　　بباز یچہ صد گونہ ماتم گرفتہ

یعنی آپ ہی کو مارتا ہے اور آپ ہی بطور کھیل کے ماتم کرتا ہے۔

بروئیش ز گرمی نگہ تاب خوردہ　　　بکوئیش بر فتن صبا دم گرفتہ

نیارد زمن ہیچ گہ یاد ہرگز　　　مگر خوے خاقانِ اعظم گرفتہ

ظفر کز دمِ اُوست در نکتہ سنجی　　　کہ غالب بآوازہ عالم گرفتہ

یہاں دَم کے معنی افسون اور کرامت کے ہیں۔ تقدیرِ عبارت یوں ہے کہ غالب در نکتہ سنجی بہ آواز عالم گرفتہ۔

غزل مسلسل در توحید

چوں زبانہا لال و جانہا پُر ز غوغا کردۂ　　　بایدت از خویش پرسید آنچہ باما کردۂ

یہ تمام غزل توحید میں ہے۔ کہتا ہے جب کہ تو نے ہماری زبانیں گونگی کر دی ہیں اور باوجود اس کے جانوں کے اندر شورش بھر دی ہے، اب تو اپنے ہی سے پوچھ لے کہ تو نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

گر نہ مشتاقِ عرضِ دستگاہِ حسنِ خویش　　　"جاں فدایت" دیدہ از بہرِ چہ بینا کردۂ

ہفت دوزخ در نہادِ شرمساری مضمر است　　　انتقام است ایں کہ با مجرم مدارا کردۂ

کہتا ہے کہ شرمندگی وہ عذاب ہے جس کی نہاد یعنی ذات میں ساتوں دوزخ چھپی

ہوئی ہیں۔ پس اگر تو نے گنہگار کے ساتھ مدارا یعنی رعایت کی اور اس کو بخش دیا، تو یہ عین انتقام ہے، وہ اس شرمندگی سے کہ باوجود اس قدر گناہوں کے ہم کو کچھ سزا نہیں دی، گویا سات دوزخوں میں جھونک دیا گیا۔

مژدہ باد آنرا کہ محوِ ذوقِ فردا کردۂ صد کشاد آنرا کہ ہم امروز رخ بنمودۂ

باد رستاں گر تو از نہہائے پیدا کردۂ خستگاں را دل بہ پرسشہائے پنہاں بردۂ

"خستگاں" زخمی اور شکستہ دل لوگ۔ یعنی جن کی حالتِ زار بظاہر ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا ان پر خدا کا غصہ ہے۔ "درست" صحیح و سالم کو کہتے ہیں، "درستان" اس کی جمع ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کی حالت درست اور ہر ایک خستگی اور شکستگی سے محفوظ ہے، گویا ان پر خدا کی عنایت و مہربانی سب سے زیادہ ہے۔ کہتا ہے کہ اگر تو نے درستوں پر ظاہری عنایتیں مبذول فرمائی ہیں، تو زخمی دلوں کو پوشیدہ مہربانیوں سے مفتوں کیا ہے۔

تلخی مے در مذاقِ ما گوارا کردۂ چشمۂ نوش ست از زہرِ عتابت کامِ جاں

خدا تعالیٰ کے غصے اور عتاب کو چشمۂ نوش قرار دیتا ہے، اور اس کو شراب سے تشبیہہ دی ہے کہ جس طرح شراب کا ذائقہ ہر شخص کو تلخ معلوم ہوتا ہے مگر شرابیوں کے مذاق میں اس سے زیادہ کوئی شے خوشگوار نہیں، اسی طرح تیرا عتاب گو بظاہر تلخ معلوم ہو، مگر تیرے عشاق اس کو چشمۂ نوش سمجھتے ہیں۔

خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردۂ جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است

کہتا ہے کہ تو نے مخلوقات کو پیدا کر کے اس میں اپنے حسن کا آپ تماشا دیکھا ہے، تو گویا جلوۂ حسن اور نظارۂ عشق درحقیقت ایک ہی جنس سے ہیں۔ یعنی ناظر اور منظور ایک چیز ہیں۔

پیش ازاں کیں درد آنرا مبتلا کردۂ چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود

کہتا ہے کہ بیماری تو جاندار کے ساتھ مخصوص تھی، اور بیماری کا علاج سنگ و گیاہ یعنی معدنیات اور نباتات میں تھا؛ پس تو نے جانداروں کے پیدا کرنے سے پہلے سنگ و گیاہ کو مہیا کر دیا، جیسا کہ علم جیولوجی میں پہاڑوں اور درختوں کا حیوان اور انسان سے پہلے پیدا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔

عقدہ ہا از کارِ غالب سربسر وا کردہٗ — دیدہ میگرید، زباں می نالد و دل می تپد

مقطع میں پھر اپنی عادت کے مطابق شوخی کی ہے۔ تمام نا ملائم حالتوں کو جو قائل پر گزر رہی ہیں، ان کو ازراہِ شوخی اور طنز کے عمدہ پیرایے میں ڈھالا ہے۔ کہتا ہے کہ آنکھ روتی ہے، زبان فریاد کرتی ہے، اور دل تڑپتا ہے۔ گویا تمام عقدے تو نے حل کر دیے ہیں۔ چوں کہ آنکھ کا رونا، زبان کا فریاد کرنا اور دل کا تڑپنا ان تینوں حالتوں میں ایک کشایش کی صورت محسوس ہوتی ہے، اس لیے ان تمام حالتوں کو اپنے عقدوں کے حل کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ اگر اس مضمون کو شوخی پر محمول نہ کیا جائے، تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ عشق کی معراج یہی ہے کہ آنکھ روئے، زبان فریاد کرے، اور دل تڑپے۔ پس غالب پر جو یہ حالتیں طاری ہیں گویا عشق کی راہ میں جتنے عقدے تھے، وہ تو نے سب حل کر دیے۔

غزل مسلسل عاشقانہ

تا ہم ز دل برد کافرادائے	بالا بلندے، کوتہ قبائے
چوں مرگِ ناگہ بسیار تلخے	چوں جانِ شیریں اندک وفائے
در کام بخشی ممسک امیرے	در دل ستانی مبرم گدائے
گستاخ سازے، پوزش پسندے	طاقت گدازے، صبر آزمائے
از خوے ناخوش، دوزخ نہیبے	وز روے دلکش، مینو لقائے
زردشت کیشے آتش پرستے	برسم گزارے، زمزم سرائے

بَرسَم. جھاؤ یا انار وغیرہ کی بالشت بالشت بھر کی لکڑیاں کاٹ کر آتش پرست رکھ لیتے ہیں اور عبادت یا نہانے، یا کھانے کے وقت ان کو ہاتھ میں لے کر پڑھتے ہیں۔ "برسم گزار" اور "زمزم سرائے" آتش پرست کو کہتے ہیں۔ زمزم اور زمزمہ وہ دعا ہے جو آتش پرست بَرسَم ہاتھ میں لے کر پڑھتے ہیں۔

در کینہ ورزی، تفسیدہ دشتے　　　در مہربانی، بستاں سرائے

تفسیدہ دشت، تپتا ہوا صحرا۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

از زلفِ پُرخم، مشکیں نقابے　　　از تابشِ تن زرّیں ردائے

یعنی زلفِ پُرخم اس کے چہرے پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سیاہ نقاب منہ پر پڑی ہوئی ہو۔ اور جو کپڑا وہ بدن پر ڈالتا ہے، وہ بدن کی چمک دمک سے سنہرا معلوم ہوتا ہے۔

در عرضِ دعوے، لیلےٰ نکوہے　　　بر رغمِ غالبؔ، مجنوں ستائے

یعنی جب دعویٔ حسن و جمال کرتا ہے، تو لیلیٰ کی ہجو کرتا ہے، اور غالب کے چڑانے کو مجنوں کی تعریف کرتا ہے کہ وہ بڑا عاشقِ صادق تھا۔

عاشقانہ

تو کے زجور پشیماں شدی، چہ می گوئی　　　دروغِ راست نمائی کہ داشتی، داری

یعنی تو جو یہ کہتا ہے کہ "میں ظلم سے پشیمان ہو گیا ہوں" تو کب پشیمان ہوا ہے؟ کیوں کہ وہ جھوٹ جو سچ معلوم ہو، جیسا تو پہلے بولتا تھا، اب بھی بولتا ہے۔ پس تیرا یہ کہنا کہ میں ظلم سے پشیمان ہوں، یہ بھی اسی ظلم میں داخل ہے۔

عاشقانہ

بسینہ چوں دل و در دل چو جاں خزیدی و باز　　　نگاہِ مہر فزائے کہ داشتی، داری

کہتا ہے کہ تو سینے میں دل کی طرح اور دل میں جان کی طرح بیٹھ چکا ہے، پھر بھی

تیری نگاہِ مہر کا وہی حال ہے جو پہلے تھا کہ محبت کی آگ بھڑکائے چلی جاتی ہے۔

عاشقانہ

عتاب و مہرِ تو از ہم شناختن نتواں　　　خرد فریب ادائے کہ داشتی، داری

شکایتِ روزگار

جہانیاں ز تو برگشتہ اند گر، غالب!　　　ترا چہ باک؟ خدائے کہ داشتی، داری

تصوّف

بیہودہ نیست سعیِ صبا در دیارِ ما　　　اے بوے گُل پیامِ تمنّاے کیستی

عاشقانہ

یادش بخیر تا چہ قدر سبزہ بودۂ　　　اے طرفِ جوئبارِ چمن! جاے کیستی

وجاے کسے سبز بودن، اس کی جگہ کا خالی رہنا۔ اور سبز ہونے کے معنی سرسبز و شاداب ہونے کے بھی ہیں۔ طرف جوئبار، کنارۂ جوئبار۔ چمن کی پٹڑی پر سبزہ دیکھ کر کہتا ہے کہ اے کنارۂ جوئبار چمن، تو جو اس قدر سرسبز و شاداب ہے، تو کس کی جگہ ہے؟ کیوں کہ وہاں معشوق کو نہیں پایا، اس لیے بطور شگونِ نیک کے اوّل یادش بخیر کہہ کر پھر سوال کرتا ہے۔

تصوّف

نشنیدہ لذّتِ تو فرو می رود دِلِ　　　اے حرفِ محوِ العلِ شکر خاے کیستی

از ہیچ نقشِ غیر نکوئی ندیدۂ　　　اے دیدہ! محوِ چہرۂ زیباے کیستی

با ہیچ کافر، ایں ہمہ سختی نہ می رود　　　اے شب! بمرگِ من کہ تو فرداے کیستی

بمرگِ من یعنی اے شب تجھ کو میری موت کی قسم چوں کہ اس وقت اپنی موت سے زیادہ کسی چیز کو عزیز نہیں سمجھتا، اس لیے رات کو اپنی موت کی قسم دے کر پوچھتا ہے کہ تو کس کی فرداے قیامت ہے؟ یعنی جو سختی کہ تجھ میں میرے اوپر گزر رہی ہے،

کسی کافر کے ساتھ نہ گزرتی ہو گی۔ پھر تو کافر سے بھی بڑھ کر کون سے گنہگار کی قیامت کا دن ہے، بتا تو سہی؟

غزل مسلسل عاشقانہ

ایکہ گفتم: ندہی دادِ دل، آرے ندہی
تا چو من دل بمغاں شیوہ نگارے ندہی

چشمۂ نوش بہانہ: ترا دد ز دلے
کش نگیری و در اندیشہ فشارے ندہی

کہتا ہے کہ اس دل سے یقیناً چشمۂ نوش نہیں ٹپک سکتا جس کو کہ تو بھینچ کر تصور میں فشار نہ دیوے۔ یعنی جب تک کہ دل عشقِ مجازی کے صدمے نہیں جھیلتا اور طرح طرح کی کوفت اس میں نہیں اٹھاتا اس میں صفائی اور لطافت اور گھلاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔

ماہ و خورشید دریں دائرہ بیکار نیند
تو کہ باشی کہ بخود زحمتِ کارے ندہی

اور وہ کام یہی ہے کہ عشق کے شکنجے میں دل کو فشار دیا جائے۔

سر براہ دم شمشیر جوانے نہ نہی
تن بہ بندِ غمِ فتراک سوارے ندہی

خوں بذوقِ غمِ یزداں نشناسے نخوری
دیں بمہرِ حقِ الفت مگذارے ندہی

یزداں نشناس اور حقِ الفت مگذار، دونوں مرکب صفتیں ہیں۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

آخر کار نہ پیداست؟ کہ در تن فسرد
کفِ خونے کہ بداں زینتِ دارے ندہی

فسرد، فسردن کا مضارع ہے۔ فسردن، ٹھٹھر جانا، خشک ہو جانا۔ یعنی کیا یہ بات ظاہر نہیں ہے کہ وہ خون جس سے تو کسی صلیب کو رنگین نہ کرے، مرنے کے بعد بدن میں خشک ہو کر رہ جائے گا۔

حیف اگر تن لیگانِ سرِ کوئے نہ دہد
وائے اگر جان لبسرِ راہ گذارے ندہی

رہزنانِ اجل از دستِ تو ناگاہ برند
نقدِ ہوشے کہ لبسودائے بہارے ندہی

بجُرمِ عُمدہ حورانِ بہشت آویزند — ناز پروردہ دلے را کہ بیاے ندہی
گر تنزّل نہ بود، ابرِ بہاری، غالب! — کہ دُرافشانی وزافشاندہ شمارے ندہی

یعنی اگر اس کہنے میں تیری کسرِ شان نہ ہو، تو اے غالب، تیری مثال ابرِ بہاری کی سی ہے کہ موتی برساتا ہے اور اس کی گنتی نہیں بتاتا، یعنی بے شمار موتی برساتا ہے۔

تصوّف

دریا زحباب آبلہ پائے طلب ہست — نورِ نظرِ اے گوہرِ نایاب! کجائی
شوریست نواریزیِ تارِ نفسم را — پیدا نہ اے جنبشِ مضراب! کجائی

یعنی میرے تارِ نفس سے شعلے نکل رہے ہیں، انھوں نے ایک شور برپا کر رکھا ہے، مگر اے جنبشِ مضراب کہ جس سے یہ تار بج رہا ہے، تو کہاں ہے؟ تیرا کہیں پتا نہیں۔

فخریہ

بنمائے بہ گوسالہ پرستاں یدِ بیضا — غالب بہ سخن صاحبِ فرتاب، کجائی؟

و فرتاب، کرامت اور معجزے کو کہتے ہیں۔ گوسالہ پرستوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ناقص العیار شاعروں کو مانتے ہیں۔

تصوّف

دیدہ ور آنکہ، تا نہد دل بہ شمارِ دلبری — در دلِ سنگ بنگرد، رقصِ بتانِ آزری

'دیدہ ور' یعنی صاحبِ نظر، وہ شخص ہے کہ جب اس کو یہ خیال پیدا ہو کہ دنیا میں کون سی چیزیں دل کش و دل رُبا ہیں، تو وہ ان گھڑے پتھر کے اندر بتانِ آذری کو رقص کرتے ہوئے دیکھ لے یعنی مادے میں جو قابلیت اور استعداد خدا نے ودیعت کی ہے، وہ پہلے اس سے کہ قوت سے فعل میں آئے، اُس پر ظاہر ہو جائے۔

تصوّف

اے تو کہ ہیچ ذرہ را، جز بہ رہِ تو روی نیست — در طلبت تواں گرفت، بادیہ را بہ رہبری

یہ خطاب ہے جنابِ احدیت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جس ذرّے کو دیکھیے، اس کا منہ تیرے ہی رستے کی طرف پھرا ہوا ہے اور اس لیے تیری راہِ طلب میں خود بادیہ یعنی صحرا کو اپنا رہبر بنایا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کا ہر ذرہ تیری طرف رہنمائی کرتا ہے۔

تصوّف

ہر کہ دلست در برش، داغِ تو رویدش ز دل تا چو بدیگرے دہد، باز بری بداوری

کہتا ہے کہ جس کے پہلو میں دل ہے، اس کے دل سے تیرا داغ روئیدگی کی طرح اُگتا ہے، اور یہ اس لیے کہ اگر وہ دل کسی اور سے لگا لے، تو اس حجت سے کہ تیری نشانی اس پر موجود ہے، وہاں سے اپنی چیز یعنی دل واپس لے لے۔ داوری، جھگڑا، ٹنٹا اور حجت۔

تصوّف

رشک ملک چہ و چرا؟ چوں بتو رہ نمی برد بیہدہ در ہوائے تو می پرّد از سکسری

یعنی ہم ملائکہ پر کیوں رشک کریں جب کہ وہ بھی بے فائدہ تیری تلاش میں پرواز کرتے پھرتے ہیں اور تجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔

تصوّف

حیف کہ من بخوں تپم، وز تو سخن رود کہ تو اشک بدیدہ بشمری، نالہ بسینہ بنگری

یعنی افسوس کہ میں تو خون میں پڑا ہوا لوٹوں اور تیری نسبت یہ کہا جائے کہ تو آنسو آنکھ کے اندر گن لیتا ہے اور فریاد کو سینے کے اندر دیکھ لیتا ہے۔

زار نالی

کوثر اگر بمن رسد، خاک خورم ز بے نمی طوبیٰ اگر ز من شود، ہیمہ کشم ز بے بری

یعنی میری شومیِ بخت کا یہ حال ہے کہ اگر کوثر مجھ کو مل جائے تو اس میں نمی باقی نہ رہے اور مجھے اس سے خاک کے سوا کچھ حاصل نہ ہو اور اگر طوبیٰ میری مِلک ہو جائے

تو وہ ایسا بے بَر ہو جائے کہ اس کی لکڑی ایندھن کے کام آئے۔

حالتِ فکرِ شعر

بینیم از گدازِ دل، در جگر آتشے چو سیل غالب، اگر دمِ سخن رہ بضمیرِ من بری

کہتا ہے کہ اگر فکرِ شعر کے وقت تو میری حالتِ درونی کو ٹٹولے، تو دل کے گداز سے ایک آگ کی رَو بہتی ہوئی تجھ کو نظر آئے۔ یہ اس جوش اور اس آگ کا بیان ہے جو اصلی شاعروں کے دل میں شعر کہتے وقت بھڑکتی رہتی ہے۔

مرزا کی غزلیات جو مقدار میں چار ہزار بیت سے کچھ زیادہ ہیں، اور جن میں منتخب اور برگزیدہ اشعار ایک چوتھائی سے کم نہ ہوں گے، ان میں سے کسی قدر اشعار جو سرسری نظر میں صاف اور عمدہ معلوم ہوئے، بطور نمونے کے یہاں نقل کرد گئے ہیں، تاکہ جو لوگ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں، مگر اتنا دماغ نہیں رکھتے کہ مرزا کے کلام کو اوّل سے آخر تک بنظرِ غور دیکھیں، وہ مرزا کی غزل کا نمونہ دیکھ کر اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ مرزا کی غزل شعرائے ایران کے کون سے طبقے کی غزل سے مناسبت رکھتی ہے؛ اور ان کی اور مرزا کی غزل میں کیا نسبت پائی جاتی ہے؟ اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ اس موقع پر مرزا کی چند غزلوں کا موازنہ ان سب لوگوں کی غزلوں کے ساتھ کیا جاتا جن کی غزل پر مرزا نے اپنی غزل بلکہ اپنی تمام شاعری کی بنیاد رکھی ہے یعنی نظیری، عرفی، ظہوری، طالب وغیرہ۔ مگر چوں کہ اس مختصر میں زیادہ گنجایش نہیں، اور نیز عام طبائع کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دل بستگی بھی نہیں معلوم ہوتی، اس لیے یہاں مرزا کی صرف دو غزلوں کا مقابلہ نظیری اور ظہوری کی غزلوں سے کہ اس وقت ان دونوں کے دیوان ہمارے پاس موجود ہیں، کیا جاتا ہے۔

نظیری کی جو مشہور غزل پا خفتست اور بلا خفتست ہے، مرزا صاحب نے بھی اس پر غزل لکھی ہے۔ نظیری کی غزل نو بیت کی ہے، جس میں سے ایک شعر پڑھا نہیں گیا۔ اور مرزا کی غزل بارہ بیت کی ہے۔ اس لیے مرزا کی غزل میں سے بھی اوّل صرف آٹھ بیتیں لی جائیں گی، تا کہ ٹھیک ٹھیک موازنہ ہو سکے اور بعد موازنے کے باقی اشعار بھی نقل کر دیے جاویں گے۔

غالب	نظیری
بوادیے کہ دراں خضر را عصا خفتست	نظر بظاہر و صیاد در خفا خفتست
بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست	اجل رسیدہ چہ داند، بلا کجا خفتست

نظیری نے اس بات کو کہ عشق ایسے طور پر دفعۃً پیدا ہو جاتا ہے جس کا سان گمان تک نہیں ہوتا، ایک معمولی حالت کے پیرایے میں جو ہمیشہ صید اور صیاد کے باہم گزرتی رہتی ہے، بیان کیا ہے۔ نظیری کا بیان، جیسا کہ ظاہر ہے، بہت صاف اور نیچرل ہے۔ اور گو یہ مطلع اس کے اعلیٰ درجے کے اشعار میں محسوب نہیں ہو سکتا، لیکن مرزا کے مطلع سے بہر حال بہتر ہے۔

مرزا نے گویا اپنی ناگوار زندگی کا دشوار گزار مرحلہ خوشی خوشی طے کرنے کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے کہ جس خطرناک وادی میں حضرتِ خضر بھی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں، میں وہاں سینے کے بل چلتا ہوں۔ مرزا کے اس مطلع پر ان کی زندگی میں "عصا خفتست" کے لفظ پر اعتراض ہوا تھا؛ مرزا نے جواب دیا کہ سعدی نے بھی تو کہا ہے:

ولے بحملۂ اوّل عصائے پیر بخفت

مگر اس جواب کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا، کیوں کہ شیخ کے ہاں اس قدر قرائن موجود ہیں کہ "عصا خفتن" سے جو معنی اُس نے بطور استعارے کے مراد رکھے ہیں، ان کے سوا دوسرے معنی کی طرف خیال ہی نہیں جاتا، بخلاف مرزا کے شعر کے کہ جب تک

یہ نہ جتایا جاوے کہ سعدی نے عصاخفتن کے یہ معنی لیے ہیں، تب تک اس سے یہ معنی مفہوم نہیں ہو سکتے۔

نظیری

غالب

کجا ز عشوۂ آں چشمِ نیم باز رہیم
کہ فتنہ خاستہ از خواب و پاے ما خفتست

دگر ز ایمنیِ راہ و قربِ کعبہ چہ حظ
مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

نظیری معشوق کی اس حالت کو جب کہ وہ سوتے سے اٹھا ہو اور آنکھیں کچھ کھلی اور کچھ مُندی ہوں اور اپنا جی اس کے سامنے سے پرے ہٹنے کو چاہتا نہ ہو، اس طرح ادا کرتا ہے کہ فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے اور ہمارا پاؤں سو گیا ہے۔ پس اس کی چشمِ نیم باز کے عشوے سے کیوں کر رہائی ہوگی

مرزا مسافر کی اس حسرت ناک حالت کو جب کہ راہ بے خطر اور منزلِ مقصود قریب ہو، مگر نہ مسافر میں، نہ اس کی سواری میں، آگے قدم اٹھانے کی طاقت ہو، اس طرح بیان کرتے ہیں "دگر ز ایمنیِ راہ الخ" ان دونوں شعروں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر مطلقاً ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ جو عاشقانہ مضامین کو پسند کرتے ہیں، وہ ضرور نظیری کے شعر کو پسند کریں گے۔ مگر اس لحاظ سے کہ مرزا کا بیان عاشق اور غیر عاشق سب کے حالات پر حاوی ہے، اور ہر شخص جس پر ایسی حالت گزرے، اس کا مصداق ہو سکتا ہے، یقیناً نظیری کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے۔

نظیری

غالب

کسی بہ قلبِ سشیم ترکتاز می آرد
کہ بر فراشِ قصب، پاے در حنا خفتست

عمت بشہر شبیخوں زناں بہ بنگِ خلق
عسس بخانہ و شہ در حرم سرا خفتست

نظیری کا شعر محض عاشقانہ ہے اور اس لحاظ سے کہ یہ مضمون اوّل اس کو سوجھا ہے، مرزا کے شعر پر ترجیح دینے کے قابل ہے۔ کہتا ہے کہ میرے گھر پر آدھی رات

گئے وہ شخص آکر ڈاکا ڈالتا ہے، جو ریشمی بچھونوں میں، پانوں کو مہندی لگائے پڑا سوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کا تصور اور اس کا خیال، بغیر اس کے کہ اس کو اطلاع ہو، رات کو آکر چھاتی پر سوار ہو جاتا ہے اور راحت و آرام بالکل برباد کر دیتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ تیرا غم شہر میں لوگوں کے گھر دل پر شبخون مار رہا ہے اور کوتوال اپنے گھر میں اور بادشاہ محل سرا میں چین سے پڑے سوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مرزا کے دل میں یہ خیال نظیری کے شعر کی وجہ پیدا ہوا ہے، مگر مرزا کی غیر معمولی اُپج اور بلند پروازی کے لیے صرف یہی اقتباس کافی ہے کہ تھوڑے سے تصرف سے نظیری کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ نیز مرزا کے بیان میں حقیقت و مجاز دونوں پہلو موجود ہیں اور نظیری کا بیان صرف مجازی معنی میں محدود ہے۔

نظیری	غالب
شمیم مہر ز باغِ وفا نمی آید	ببیں ز دور و مجو قربِ شہ کہ منظر را
بہر چمن کہ تو بشگفتہ، صبا خفتست	دریچہ باز و بدروازہ اژدہا خفتست

اگرچہ مآل دونوں شعروں کا واحد ہے، مگر دونوں کے بیان کا عالم الگ الگ ہے۔ نظیری اس طرح بیان کرتا ہے کہ وفائے حقیقی کے باغ سے مہر و التفات کی خوشبو نہیں آتی، گویا جس چمن میں وہ پھول (یعنی معشوقِ حقیقی) کھلا ہوا ہے وہاں کی صبا پڑی سوتی ہے یعنی اس کو اہتزاز مطلق نہیں ہے، جس سے اُس چمن کی خوشبو عالم میں پھیلے۔

مرزا یوں کہتے ہیں کہ آثار و افعال کے ذریعے سے اس کو دور ہی سے دیکھ لو، اور "قربِ شاہ" یعنی ذاتِ بحت کی تلاش مت کرو، کیوں کہ اگرچہ جھروکے کے پٹ

کھلے ہوئے ہیں (یعنی اُس کے آثار و افعال سب پر ظاہر ہیں) مگر اندر کوئی نہیں جانے پاتا، کیوں کہ عین دروازے پر اژدھا سوتا ہے۔ اس تقریر سے ظاہر ہے کہ مآل دونوں کا یہ ہے کہ معرفتِ ذات محالات سے ہے۔ مگر ہمارے نزدیک مرزا کا بیان نظیری کے بیان سے زیادہ بلیغ اور زیادہ دلکش واقع ہوا ہے۔

غالب	نظیری
بصبح حشر چنیں خستہ رُوسیہ خیزد	طبیبِ عشق ببرد طمع ز بیمارے
کہ در شکایت درد و غم دوا خفتست	کہ شب براحت ازیں دردِ بے دوا خفتست

نظیری کہتا ہے کہ مرضِ عشق کا طبیب اُس بیمار کے علاج سے مایوس ہو جاتا ہے کہ جو کسی رات کو اس دردِ بے دوا یعنی عشق کی بے چینی سے آرام کے ساتھ سو گیا ہو؛ گویا مریضِ عشق کی علامتِ محمودیہی ہے کہ اس کو کبھی راحت نصیب نہ ہو۔ مگر شعرائے متصوفین کے اصول کے موافق نظیری کے بیان میں یہ خلل تھا کہ وہ راحت کو ردی علامت بتاتا ہے۔ حال آنکہ عاشقِ صادق کی علامت یہی ہے کہ اس کو دوست کی راہ میں درد اور تکلیف کبھی محسوس ہی نہ ہو، بلکہ ہر ایک درد اور تکلیف عین راحت معلوم ہو۔ پس نظیری کے بیان سے گویا یہ لازم آتا تھا کہ عاشقِ صادق وہی ہے، جو ہمیشہ بے چینی اور بے قراری میں بسر کرے۔ اور جب ایسا ہو گا تو کبھی نہ کبھی شکایت بھی اس کی زبان سے نکلے گی۔

مرزا نے اسی لیے اس مضمون کو الٹ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بیمار حشر کے دن رُوسیاہ اٹھے، جو دردِ دل کی شکایت اور دوا کی تلاش کرتا ہوا سو یا ہے۔

غالب	نظیری
درازیِ شبِ بیداریِ من ایں ہمہ نیست	کس از معانقۂ روزِ وصل یابد ذوق
ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفتست	کہ چند شب ز ہم آغوشِ خود جدا خفتست

نظیری کا شعر صاف ہے۔ کس ؟ آں کی جگہ لایا ہے۔ معانقۂ روزِ وصل، وہ معانقہ جو وصل کے دن عاشق و معشوق میں واقع ہو۔ شعر کا مضمون معمولی ہے، مگر الفاظ نے جان ڈال دی ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ شبِ ہجر کی درازی اور میری بیداری کا کیا خیال کرتے ہو، یہ تو کچھ بھی بات نہیں ہے۔ ہاں، یہ تلاش کرو کہ میرا نصیب کہاں پڑا سوتا ہے؟ کیوں کہ رات کی درازی، اور میری بیداری اور ایسی ایسی اور سیکڑوں مصیبتیں سب اسی کے سو جانے سے پیدا ہوئی ہیں۔ محاکمہ دونوں میں یہ ہے کہ نظیری کا شعر زیادہ نیچرل اور حالی ہے، اور مرزا کے شعر میں شاعرانہ لطافت اور خوبی نظیری کے شعر سے زیادہ ہے اور کوئی بات اس میں اَن نیچرل بھی نہیں ہے۔

نظیری	غالب
شبِ امید بہ از روزِ عید می گزرد	بدیں نیاز کہ با تست، ناز می رسدم
کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفتست	گدا بہ سایۂ دیوارِ پادشا خفتست

نظیری کا شعر اس کی تمام غزل میں بیت الغزل ہے، بلکہ اس کے سارے دیوان کے اُن ۲، ۲ نشتروں میں سے ایک نشتر ہے، جو اساتذہ نے اس کی غزلیات میں سے انتخاب کیے ہیں۔

مرزا کا شعر گو نظیری کے شعر کی برابری نہیں کر سکتا، مگر ایسے بلند شعر پر یہ شعر نکالنا مرزا ہی کا کام تھا۔ تشبیہ نہایت بلیغ اور دل نشین واقع ہوئی ہے یعنی مجھ جیسے ادنیٰ درجے کے آدمی کو جو تیری جناب میں نیاز ہے، اس پر مجھ کو ایسا ہی ناز ہے جیسا اس فقیر کو ہونا چاہیے جو بادشاہی محل کی دیوار کے سایے میں پڑا ہو۔

نظیری	غالب
فسانہ حرفِ نظیری مکن کہ خواب کند	بخواب چوں خودم آسودہ دل بداں غالبؔ
شکستۂ کہ بصد درد مبتلا خفتست	کہ خستہ غرقہ بخوں خفتہ است تا خفتست

نظیری کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ نظیری کو فسانہ اس غرض سے سُنانا فضول ہے کہ ایک شکستہ و کوفتہ آدمی (نظیری) جو طرح طرح کی تکلیف میں مبتلا ہو کر پڑ رہا ہے، وہ سو رہے گا۔

مرزا کے شعر کا ماحصل یہ ہے کہ اگر میں سو بھی جاؤں تو اے غالبؔ! مجھ کو اپنی طرح آسودہ اور خوشحال نہ سمجھنا، کیوں کہ بیمار (یعنی میں) جب سویا ہوں تو خون میں ڈوبا ہوا سویا ہوں۔ پس ایسے شخص کو سوتے جاگتے کیا راحت نصیب ہو سکتی ہے۔

یہاں تک دونوں غزلوں میں سے صرف آٹھ آٹھ شعر ہم نے نقل کیے ہیں اور مرزا کے آٹھ شعر وہ لکھے ہیں، جو کسی نہ کسی قدر نظیری کے اشعار سے لفظی یا معنوی مناسبت رکھتے تھے۔ اب مرزا کے باقی اشعار، جو نظیری کی غزل سے تعداد میں زیادہ ہیں، لکھتے ہیں۔

خروشِ حلقۂ رنداں زنازنیں پسر لیست	کہ سر بہ زانوے زاہد بہ بوریا خفتست
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز	گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست
دلم بسُبحہ و سجّادہ و ردا لرزد	کہ دُزدِ مرحلہ بیدار و پارسا خفتست
براہ خفتنِ من ہر کہ بنگرد، داند	کہ میرِ قافلہ در کارواں سرا خفتست

پہلا شعر محض رندانہ ہے، اور زبان کی گرمی اور شوخی کے سوا اور کوئی معنوی لطافت نہیں رکھتا۔ اس کے بعد کے تینوں شعر ہم تے کی ردیف کے انتخابی اشعار میں مع ہر ایک کی شرح کے لکھ آئے ہیں۔ ان میں سے پہلا شعر ہمارے نزدیک مرزا کی تمام غزل میں بیت الغزل ہے اور پچھلے دونوں شعر بھی نظیری کی غزل کے عام اشعار سے رتبے میں کم نہیں ہیں۔ پس اگر نظیری کا بہت ادب کیا جائے، تو ہم اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ دونوں غزلوں کو

مساوی درجے میں رکھیں؛ ورنہ انصاف یہی ہے کہ ہیأتِ مجموعی کے لحاظ سے مرزا کی غزل نظیری کی غزل سے یقیناً بڑھ گئی ہے۔ لیکن ایک آدھ غزل میں نظیری سے سبقت لے جاتے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کی غزل کو مطلقاً نظیری کی غزل پر ترجیح دی جائے۔ نظیری وہ شخص ہے جس کی نسبت مرزا صائب کہتے ہیں:

"صائب! چہ مجال ست شوی ہمچو نظیری　　عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را"

اور مرزا جلال اسیر کہتے ہیں

ہمچشمی نظیری حدِ بشر نباشد

اور شیخ ابوالفضل آئینِ اکبری میں اس کی نسبت لکھتے ہیں:

درے از زہ نگاہِ معنی بروئے کشودہ اند

پس ہماری غرض مذکورہ بالا غزلوں کے مقابلہ کرنے سے صرف اس قدر تھی کہ مرزا نے غزل میں نظیری کے تتبع کو جس درجے تک پہنچایا تھا، اس سے لوگ اچھی طرح مطلع ہو جائیں۔ ورنہ اس غزل کے سوا اور جس قدر غزلیں مرزا نے نظیری کی غزلوں پر لکھی ہیں، ان میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو گی، جس میں نظیری کی غزل کا پلہ مرزا کی غزل سے غالب نہ ہو کیوں کہ اکثر پچھلے شعرا اگلوں کی انھیں غزلوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں، جو ان کے سارے دیوان میں چیدہ و برگزیدہ اور منتخب ہوتی ہیں۔ پس ایسی زمینوں میں اگلوں سے پچھلوں کا سبقت لے جانا کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔

اب ہم مرزا کی ایک غزل کا موازنہ ظہوری کی غزل کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ دونوں غزلیں شیخ سعدی کی اس غزل پر لکھی گئی ہیں:

شبِ فراق چہ داند کہ تا سحر چند است　　مگر کسیکہ بہ زندانِ عشق دربند است

اگرچہ مرزا نے ظہوری کی غزلوں پر بہت کم غزلیں لکھی ہیں، مگر چوں کہ وہ اپنے تئیں

ظہوری کا تتبع ظاہر کرتے ہیں، اس لیے اس کی ایک غزل کے ساتھ بھی مرزا کی غزل کا موازنہ کرنا ضرور تھا۔ ظہوری کا دیوان جو ہمارے پاس موجود ہے، اس میں یا تو کاتبوں کی تصحیف سے، اور یا خود ظہوری کی پیچیدہ بیانی کے سبب، اکثر اشعار کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ بہت مشکل سے صرف ایک غزل ایسی نکلی ہے، جس کے ہر ایک شعر کے کچھ نہ کچھ معنی اپنی سمجھ کے موافق لگا لیے گئے ہیں اور اس کے تمام اشعار کا مقابلہ بعض اصحاب کی معرفت دوسرے صحیح نسخے سے بھی کر لیا گیا ہے؛ اس لیے وہی غزل موازنے کے لیے انتخاب کی گئی ہے اور چونکہ وہ شیخ کی غزل پر لکھی گئی ہے، اس واسطے یہ خیال کیا گیا ہے کہ ظہوری نے اس میں اپنی پوری طاقت صرف کی ہوگی۔ ایک اور وجہ اس غزل کی تخصیص کی یہ ہے کہ مرزا نے اپنی تمام غزل میں ایک شعر کے سوا تمام اشعار میں وہی قافیے باندھے ہیں، جو ظہوری کے ہاں بندھے ہوئے تھے؛ اور نیز دونوں غزلیں ابیات کی تعداد کے لحاظ سے بھی برابر یعنی دس دس بیت کی ہیں۔

غالب	ظہوری
چو صبحِ من ز سیاہی بشام ماندست	بعشق قابلِ دیوانگی خردمندست
چگویم کہ ز شب چند رفت یا چندست	بُبُرز جملہ کہ آزاد، مردِ ایں بندست

ظہوری کہتا ہے کہ عشق میں جو شخص دیوانگی کی قابلیت رکھتا ہے، اسی کو خردمند سمجھا چاہیے۔ پس چاہیے کہ تو سب سے قطع تعلق کر دے، کیوں کہ جو شخص تعلقات سے آزاد ہے، وہی بندِ عشق کا مرد (یعنی اس کے لائق) ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ جب کہ میری صبح تاریکی کے سبب شام سے مشابہ ہے، تو مجھ سے یہ کیا پوچھتے ہو کہ رات کتنی گزری یا کتنی باقی ہے؟ مطلب یہ کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک میرے دن اور رات پر تاریکی چھائی رہتی ہے۔ پس مجھے کیا خبر کہ کتنی رات گزری

اور کتنی باقی ہے۔ ظہوری کے شعر میں اس کے سوا کچھ جدت نہیں ہے کہ اس نے اپنی عادت کے موافق اس میں بھی صنعتِ تضاد کا التزام کیا ہے (یعنی دیوانگی پر خرد مندی کا اطلاق کیا ہے اور آزاد پر مقید کا) مرزا نے ایک معمولی خیال میں جدت پیدا کی ہے اور نہایت صفائی سے مطلب ادا کیا ہے۔

ظہوری	غالب
بشکرِ دیدۂ تر، تر زبانیے دارم	نگاہ و مہر بہ دل سر ندادہ چشمۂ نوش
کہ زہرِ گریہ، طراوت دہِ شکر خند ست	ہنوز عیش باندازۂ شکر خند ست

ظہوری کہتا ہے کہ میں دیدۂ تر کے شکر میں تر زبان اور رطب اللسان ہوں کیوں کہ گریے کا زہر معشوق کے شکر خند کو طراوت دیتا ہے (یعنی ہمارے رونے پر اس کو بے اختیار ہنسی آتی ہے) گویا ہمارے آنسو خندۂ معشوق کی جڑ کو تر و تازہ رکھتے ہیں۔ مرزا کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق گو بظاہر ہم سے ہنسی خوشی کے ساتھ ملتا ہے، مگر کوئی دلی محبت کی بات اب تک ظہور میں نہیں آئی، جس سے ہمارا دل باغ باغ ہو جائے۔ اس مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے کہ ابھی تک اس کی نگاہ و مہر و محبت نے لذت و حلاوت کی سوت ہمارے دل میں جاری نہیں کی، بلکہ ہم صرف اس کے ظاہری شکر خند پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔

ظہوری کے ہاں وہی لفظی مناسبتیں جیسے دیدۂ تر اور تر زبانی یا زہر گریہ اور شکر خند بہ نسبت مرزا کے زیادہ ہیں، مگر مرزا کا شعر اس سے زیادہ بلیغ، نیچرل اور عاشقانہ ہے۔

ظہوری	غالب
مگر کہ رخصتِ بے طاقتی شود مرہم	نہ گفتہ، کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر
کہ گوشِ دل شندگاں دشِ گشتۂ پند ست	بروکہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند ست

ظہوری کہتا ہے کہ دل شدگان (یعنی ہم عاشقوں) کے کان ناصحوں کی نصیحتوں سے زخمی ہو گئے۔ ان کے اس زخم کا مرہم یہی ہو سکتا ہے کہ ان کو بے طاقتی (یعنی بے حوصلگی اور عدم تحمل) کی اجازت دی جائے، تاکہ وہ ناصح سے گلخپ ہو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

مرزا ناصح سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے ناصح! تو نے یہی نہیں کہا کہ تلخی (یعنی ہماری نصیحت) سے موافقت کر لے، اور ہمارا کہنا مان لے۔ جا، اپنا رستہ لے، ہماری شراب اس نصیحت سے زیادہ تلخ ہے، پس ہم کو تیری نصیحت کی تلخی سے آشتی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ قافیہ بھی جیسا کہ ظاہر ہے مرزا کے ہاں بہ نسبت ظہوری کے زیادہ گرم بندھا ہے۔

ظہوری	غالب
چہ غم کہ عہد گسل داردت کشاکشِ ناز	درازدستیِ من چاکی ار فگند، چہ عیب؟
کہ ہر گسیختنی صد ہزار پیوندست	ز پیش، دلقِ ورع با ہزار پیوندست

ظہوری کہتا ہے کہ اگر ناز و غمزے کی کشاکش تجھ سے عہد شکنی کراتی رہتی ہے، تو کچھ افسوس کی بات نہیں کیوں کہ ہر گسیختنی (یعنی ہر عہد شکنی) لاکھ پیوند کا حکم رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس قدر تو عہد توڑتا ہے، اسی قدر پیوندِ عشق زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ اگر میری درازدستی اور بے باکی و رند مشربی نے دلقِ ورع و تقویٰ کو کسی قدر پھاڑ ڈالا ہے، تو میرا چنداں قصور نہیں ہے کیوں کہ اس میں تو پہلے ہی سے ہزاروں پیوند لگے چلے آتے ہیں۔ یعنی خود اہلِ ورع و تقویٰ ہی اس کی دھجیاں اڑا چکے ہیں، مگر ریاکاری سے پیوند لگا لگا کر اس کا عیب ڈھانکتے رہتے ہیں۔
ظہوری کے شعر میں عشق و محبت کے ایک دقیق معاملے کی طرف اشارہ ہے، جو

عشاق پر ہمیشہ گزرتا ہے، اور صنعتِ تضاد کا التزام بھی نہیں چھوڑا کہ گسیختن پر اس کے ضدِ حقیقی یعنی پیوند کا اطلاق کیا ہے۔ باوجودے کہ ظہوری کے یہاں یہ قافیہ نہایت عمدگی سے بندھا تھا، مرزا نے بھی اس قافیے کے باندھنے میں کچھ کم دادِ بلاغت نہیں دی، یہاں تک کہ ظہوری کے شعر کو مشکل سے اُس پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔

ظہوری | غالب

بگو حدیثِ وفا از تو باور ست، بگو | نمیرم آنکہ مبادا بمیرم از شادی
شوم فدای دروغی کہ راست مانندست | نگوید ارچہ بمرگِ من آرزومندست

مرزا نے مانند کا قافیہ مطلع کے سوا پھر کسی شعر میں نہیں باندھا اور ظہوری کے ہاں آرزومند کا قافیہ کہیں نہیں بندھا اس لیے یہ دونوں مختلف القوافی بیتیں ایک جگہ لکھ دی گئی ہیں۔ معنی دونوں کے ظاہر ہیں۔ ظہوری کا شعر بہت صاف اور لطیف اور مرزا کے شعر سے زیادہ نیچرل ہے۔ مرزا نے مضمون میں جدت تو پیدا کی ہے مگر یہ سُن کر کہ معشوق ہمارے مرنے کا آرزومند ہے، خوشی سے مرجانا، واقع کے بالکل خلاف ہے۔

ظہوری | غالب

زاہلِ مہر و محبت نشاں ندارم کس | وجودِ او ہمہ حسن ست و ہستیم ہمہ عشق
بہ مہرِ خویش و بہ بیمہریِ تو سوگندست | بہ بختِ دشمن و اقبالِ دوست سوگندست

ظہوری کا شعر صاف ہے۔ اوّل دعویٰ کرتا ہے کہ مہر و محبت کا دنیا میں کہیں وجود نہیں؛ اور اس دعوے پر اپنی محبت اور معشوق کی بیمہری کی قسم کھاتا ہے، جس کی خوبی اور لطافت ظاہر ہے۔

مرزا کا دعویٰ یہ ہے کہ معشوق کا وجود سراپا حسن و جمال ہے اور میری ہستی سراسر عشق و محبت ہے اور اس دعوے پر رقیب کے نصیب کی اور معشوق کے اقبال

کی قسم کھاتا ہے، جس میں ظہوری کی قسم سے زیادہ لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ رقیب کے نصیب کی قسم اس لیے کھائی ہے کہ جو وجود سراپا حسن و جمال ہے، وہ بالکل اُسی کے حصّے میں آگیا ہے، اور معشوق کے اقبال کی قسم اس لیے کھائی ہے کہ مجھ جیسا شخص اس کے سودا میں عشق و محبت کا پتلا بن گیا ہے۔ اس کے سوا لفظی مناسبتیں جیسے حسن و عشق، وجود و ہستی، دشمن و دوست اور بخت و اقبال یا تمام شعر کا متناسب اجزا میں تقسیم ہونا، اس نے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے۔

ظہوری	غالب
شمارِ کجروِیِ دوست در نظر دارم	ز رہروانِ تو منزل شمار ما کہ شمرد
دریں نوردِ ندانم کہ آسماں چندست	غم از کسے کہ نمیداند اندہش چندست

ظہوری کہتا ہے کہ تیری راہ میں جو شخص منزلیں گنتا ہے اور یہ خیال رکھتا ہے کہ کتنا رستہ طے ہوا اور کتنا باقی ہے، اس کو تیرے رہروؤں میں کون شمار کرتا ہے؟ پھر کہتا ہے کہ "غم از کسے ست" یعنی غمِ معشوق اس شخص کا حصہ ہے جس کو اپنے غم کی کمی یا زیادتی کا مطلق شعور نہیں۔

مرزا کہتے ہیں کہ میرے خیال میں دوست کی کجروی کا تصور ایسا جما ہوا ہے کہ مجھے یہ خبر نہیں کہ اس نورد (یعنی کجروی) میں آسمان کی کتنی شرکت ہے۔ مرزا کا بیان کسی قدر ظہوری کے بیان سے صاف ہے، اگر مضمون کے لحاظ سے دونوں شعروں میں کچھ لطافت یا خوبی معلوم نہیں ہوتی۔

ظہوری	غالب
بہ رنج از پے راحت نگاہ داشتہ اند	شود گسستہ بایام، اگر چہ زنجیر است
ز حکمت است کہ پای شکستہ در بندست	اسیر آنکہ بہ تارِ نگاہ در بند ست

ظہوری کہتا ہے کہ ایک مدت کے بعد لوہے کی بیڑی بھی کٹ جاتی ہے اور قیدی

رہا ہو جاتا ہے۔ پس در حقیقت قیدی وہی ہے، جو نگاہِ معشوق میں الجھا ہوا ہے،
جس کو قید سے کبھی رہائی نہیں۔

مرزا کہتے ہیں کہ یہاں تکلیف میں اس لیے رکھا جاتا ہے کہ راحت حاصل ہو؛ اور
اس کی مثال یہ ہے کہ پاشکستہ آدمی کو چلنے پھرنے نہیں دیتے اور جب تک ہڈی
جڑ نہ جائے مقید رکھتے ہیں۔ اس سے مطلب یہی ہوتا ہے کہ آخر کار اس کو راحت
حاصل ہو۔ ظہوری کے شعر میں کسی قدر جدت ہے، مگر شعر کی بندش سست اور
ڈھیلی ہے۔ مرزا کے یہاں مضمون میں کچھ ایسی جدت نہیں ہے، مگر بیان نہایت چست
اور ٹھیک ٹھاک ہے۔

ظہوری	غالب
اگر نہ بہرِ من، از بہرِ خود عزیزم دار	زبندگان نسزد آرزو، خدا نہ کند
کہ بندہ خوبیِ او خوبیِ خداوندست	ہمیں بس ست کہ ما بندہ، او خداوندست

ظہوری کے شعر میں "خدا نہ کند" یا تو محض حشو ہے یا اس کے بعد کچھ عبارت مقدر ہے
یعنی "خدا نہ کند کہ ما آرزو بکنیم"۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

مرزا کا شعر ان کی غزل میں بیت الغزل ہے اور معنیً اور لفظاً دونوں طرح ظہوری
کے شعر پر ترجیح رکھتا ہے۔

ظہوری	غالب
اسیرِ عشق، ظہوری! نشانہ دارد	نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالب
نشانہ اینکہ ز بیدادِ دوست خرسندست	بدیں کہ پرسد و گویند ہست خرسندست

ظہوری کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اسیرِ عشق کی یہ پہچان ہے کہ وہ دوست کے ظلم
سے خوش رہتا ہے۔

مرزا کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ میرا مقصود وفا کی تلاش سے یہ نہیں ہے کہ میں اہلِ دنیا

سے وفا کا طالب ہوں، بلکہ میں اسی میں خوش ہوں کہ میں پوچھوں کہ "دنیا میں وفا ہے؟" اور وہ لوگ اس کے جواب میں کہیں کہ "ہاں، ہے۔" دونوں مقطع ہموار ہیں مگر باوجود اس کے مرزا کا بیان بانکپن سے خالی نہیں۔

ہم نے دونوں شاعروں کی غزلوں کی شرح بخوبی کر دی ہے، مگر زیادہ نکتہ چینی کرنا غیر ضروری سمجھا ہے اور دونوں غزلوں میں محاکمہ کرنا بھی ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ خود بشرطیکہ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں گے، اس بات کا اندازہ کر لیں گے کہ دونوں غزلوں میں کیا نسبت ہے۔

رباعیات

مرزا کی رباعیات تعداد میں قریب سوا سو کے ہیں جن میں سے اکثر شوخی و بے باکی، بادہ خواری، فخر و مباہات اور شکایت و زار نالی کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ اور کسی قدر متصوفانہ اور چند خاص خاص مضامین پر ہیں۔ خمریات میں ظاہرا عمر خیام کا تتبع معلوم ہوتا ہے۔ مرزا کی رباعی میں بہ نسبت عام غزلیات کے زیادہ صفائی و شگفتگی اور گرمی پائی جاتی ہے۔ چناں چہ اُن میں سے کسی قدر رباعیاں بطور نمونے کے یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ اور جہاں ضرورت ہوگی، رباعی کے ساتھ اس کی شرح بھی کر دی جائے گی۔

فخریہ

(۱) غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم / زاں رو بصفائی، دم تیغ ست دمم
چو رفت سپہبدی، ز دم چنگ بشعر / شد تیر شکستۂ نیاگاں، قلمم

گہر و گوہر: اصل، گودہ۔ نسل و خاندان۔ زادشم، اپشنگ کے باپ اور توراین فریدوں کے بیٹے کا نام ہے، جس کی نسل میں مرزا اپنے تئیں بتاتے ہیں۔ دم تیغ، تلوار کی دھار۔ دم یعنی میر الکلام۔ سپہبدی، سلطنت و سپہ سالاری۔ نیا، دادا، نیاگان جمع۔ کہتا ہے کہ جب سپہبدی ہماری قوم سے رخصت ہو گئی تو میں نے شعر کہنا اختیار کر لیا، گویا بزرگوں کا ٹوٹا ہوا تیر میرا قلم بن گیا۔

تفضیل

شرطست کہ بہر ضبطِ آداب و رسوم (۳) خیزد بعد از نبی، امام معصوم
زاجماع چہ گوئی، بہ علی باز گرائے مہ جائے نشین مہر باشد، نہ نجوم

یہ رباعی مرزا کے تفضیلی ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ تشیع پر کیوں کہ خلفائے ثلٰثہ پر نجوم کا اطلاق حضرات شیعہ نہیں کر سکتے۔

تصوف

راہیست ز عبد تا حضورِ اللہ (۳) خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبی کہ نشانہا دارد سرچشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

کہتا ہے کہ بندے سے خدا کی حضور تک ایک راہ ہے، خواہ اس کو دراز سمجھو، خواہ کوتاہ سمجھو۔ اور یہ جو کوثر و طوبی ہیں جن میں اس کی راہ کے کچھ کچھ نشان پائے جاتے ہیں، یہ ایسے ہیں جیسے اثنائے راہ میں چشمہ اور سایہ آجاتا ہے۔

شوخی

آں مرد کہ زن گرفت، دانا نہ بود (۴) از غصہ فراغتش، ہمانا نہ بود
دارد بہ جہاں خانہ و زن نیست درو نازم بخدا، چرا توانا نہ بود

تیسرے مصرعے میں دارد کا فاعل خدا ہے، جس کا نام چوتھے مصرعے میں لیا ہے۔ خانہ سے مراد خانۂ کعبہ ہے باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

شوخی

بادست غم آں باد کہ حاصل برد (۵) آپ رخ ہوشمند و غافل برد
بگزاشتہ ام خمے ز صہبا بہ پسر کش اندوہِ مرگِ پدر از دل برد

کہتا ہے کہ غم ایک ہوا ہے۔ ایسی ہوا کہ تمام خرمن کو اڑا کرلے جائے، اور دانا اور نادان کی آبرو کو بہالے جائے۔ اسی لیے میں بیٹے کے لیے ایک شراب کا مٹکا چھوڑ چلا ہوں، تاکہ باپ کے مرنے کا غم اس کے دل سے دھو دے۔

شوخی

اے آنکہ براہِ کعبہ رُوے داری (۶) نازم کہ گزیدہ آرزوے داری
زیں گونہ کہ تند می خرامی، دانم درخانہ زنِ ستیزہ خوے داری

کعبے جانے والے سے کہتا ہے کہ تیرا ارادہ تو بہت عمدہ ہے، مگر تو جو ایسا بھاگا جاتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ تیرے گھر میں بد مزاج عورت ہے جس کے سبب سے کعبے جانے میں اس قدر جلدی ہے۔

فخریہ

شاہا! ہر چند وایہ جو آمدہ ام (۷) دانی کہ چہ مایہ نغزگو آمدہ ام
رنگم کہ بہار را بہ رُو آمدہ ام آبم کہ بہ محیط را بجو آمدہ ام

بے تعلقی

زانجا کہ دلم بو ہم در بند نبود (۸) باہیچ علاقہ سخت پیوند نبود
مقصودِ من از کعبہ و آہنگِ سفر جز ترکِ دیارِ زن و فرزند نبود

یعنی چوں کہ میں وہم میں، جو نیست کو ہست کی صورت میں دکھاتا ہے، گرفتار نہ تھا، اسی لیے کعبے کے عزمِ سفر سے میرا مقصد زن و فرزند کا ملک چھوڑ دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

عاشقانہ

اے جامِ شراب شاد کامی زدہ (۹) درجور دم از بلند نامی زدہ
یاد آر ز من، چو بینی اندر راہے تنہا روِ خستہ، حرامی زدہ

حرامی، قزاق۔ حرامی زدہ، قزاقوں کا لوٹا ہوا۔ اس شعر میں معشوق کی طرف خطاب کیا ہے اور اپنی حالت کو اس مسافر سے مشابہ بتایا ہے جو تنہا ہو، مجروح ہو، اور قزاقوں نے اُسے لوٹ لیا، گویا معشوق کو قزاق ٹھیرایا ہے۔

شوخی

اے آنکہ تراسعی بدرمانِ من ست (۱۰) منعم مکن از بادہ کہ نقصانِ من ست
حیف ست کہ بعدِ من، بمیراث رود ایں یک دو سہ خم کہ در شبستانِ من ست

طبیب کی طرف خطاب ہے کہ مجھے بیماری میں شراب سے کیوں منع کرتا ہے؟ اگر میں مر گیا تو غضب ہو جائے گا، کہ یہ اکٹھے دو تین مٹکے میرے کام تو نہ آئیں گے، میرے وارثوں کو پہنچ جائیں گے۔

شکوۂ روزگار

آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقیِ دہر (۱۱) ریزد ہمہ دُردِ دردِ تلخ آبۂ زہر
بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا ناہید بہ غمزہ کُشت و مریخ بقہر

ناہید یعنی زہرہ کو سعد اور مریخ کو نحس قرار دیا گیا ہے۔ کہتا ہے کہ سعادت و نحوست کے خیال کو جانے دو، میرے حق میں تو سعد و نحس دونوں قسم کے ستارے نحس ہو گئے کہ زہرہ نے مجھے غمزے سے قتل کیا اور مریخ نے قہر سے۔

افسوس بر وفات مومن خان

شرطست کہ رُوی دل خراشم ہمہ عمر (۱۲) خونابہ بہ رخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگِ مومن چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

ترکِ مراد

غالب روشِ مردمِ آزاد جداست (۱۳) رفتارِ اسیرانِ رہ و زاد جداست

ما ترکِ مراد را اِرَم مے دانیم واں باغچۂ ضبطیٔ شدّاد جداست

یعنی آزاد لوگوں کی اور روش ہے اور جو لوگ توشہ اور رسم و راہ کے گرفتار ہیں، ان کا اور ڈھنگ ہے۔ ہم کہ آزاد لوگ ہیں، ہمارے نزدیک ترکِ مراد کا نام اِرَم ہے اور وہ اِرَم جس سے شدّاد محروم رکھا گیا، وہ ہمارے اِرَم سے الگ ہے۔

شکریہ درد نامہ

ایں نامہ کہ راحتِ دلِ دلریش آورد (۱۴) سرمایۂ آبروے درویش آورد

در ہر بُنِ مُو دمید جانے یعنی سامانِ نثار خویش با خویش آورد

تصوّف

منصورِ غمش زنکتہ چیناں چہ بود (۱۵) در راست خطر زہمنشیناں چہ بود

چوں عاقبتِ یگانہ بیناں دار است دریاب کہ انجامِ دو بیناں چہ بود

کہتا ہے کہ اگر منصور کو لوگ کہیں کہ سولی پر چڑھایا گیا اور ذلّت سے مارا گیا، تو منصور کو اس کی کچھ پروا نہیں۔ مگر تم دیکھو کہ جب منصور جیسے یگانہ بین لوگوں کا انجام دار ہے، تو دو بینوں کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

شوخی

ہر کس زحقیقت خبرے داشتہ است (۱۶) بر خاکِ رہِ عجز سرے داشتہ است

زاہد زخدا اِرَم بدعوے طلبد شدّاد ہمانا پسرے داشتہ است

کہتا ہے کہ جو شخص اپنی یا انسان کی حقیقت سے واقف ہوتا ہے، اس کو عاجزی کرنے کے سوا کچھ بن نہیں آتی۔ پس زاہد جو خدا سے ارم دعوے کے ساتھ طلب کرتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شدّاد نے بیٹا اپنا وارث چھوڑا تھا کیوں کہ اوّل تو ارم

جو کہ متروکۂ شداد ہے اس کا دعویٰ کرنا اور پھر خدا کے سامنے اس کے مانگنے میں ہیکڑی کرنی، یہ دونوں باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ شداد نے اپنا وارثِ حقیقی چھوڑا تھا۔

شوخی

غالب! بہ سخن گرچہ کسے ہمسر نیست (۱۰) از نشۂ ہوش ہیچت اندر سر نیست
مے خواہی و مفت و نغز و آنگہ بسیار این بادہ فروش ساقیِ کوثر نیست

کہتا ہے کہ اے غالب! اگرچہ شاعری میں کوئی تیرا ہمسر نہیں، مگر عقل کا نشہ تیرے دماغ میں بالکل نہیں ہے؛ شراب چاہتا ہے اور وہ بھی مفت اور وہ بھی عمدہ، اور پھر کثرت سے! یہ بادہ فروش ہے ساقیِ کوثر نہیں کہ تیری سب خواہشیں پوری کردے گا۔

شوخی

گردیدنِ زاہداں بجنت گستاخ (۱۸) ویں دست درازی بہ ثمر شاخ بشاخ
چوں نیک نظر کنی، زروے تشبیہ مانندِ بہائم و علف زارِ فراخ

یعنی زاہدوں کا بہشت میں بے باک پھرنا، اور جا بجا ٹہنیوں پر پھلوں کے لیے ہاتھ مارنا اگر غور کرکے دیکھو، تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک وسیع چراگاہ ہے اور اس میں ڈھور ڈنگر چرتے پھرتے ہیں۔

اخلاق

آں را کہ بود درستیِ در فرجام (۱۹) ہم محرمِ خاص آید و ہم مرجعِ عام
آساں نہ بود کشاکشِ پاسِ قبول زنہار نہ گردی بہ نکوئی بدنام!

فرجام، انجام اور رنگ و رونق کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں رنگ و رونق یعنی شہرت و ناموری مراد ہے۔ کہتا ہے کہ جس کی شہرت صحیح اور سچی ہوتی ہے، وہ ضرور ہے کہ خواص کا محرم اور عوام کا مرجع واقع ہو۔ مگر پاسِ قبول کی کشاکش یعنی ہر موقع پر

اس بات کا خیال رکھنا کہ قبولیت میں فرق نہ آئے، نہایت سخت چیز ہے۔ پس ہرگز نیکی کے ساتھ بدنام یعنی مشہور ہونا نہیں چاہیے۔ اس موقع پر بجائے مشہور کے بدنام کا لفظ نہایت بلیغ واقع ہوا ہے، جس سے ساری رباعی میں جان پڑ گئی ہے۔

شوخی

در عالمِ بے زری کہ تلخست حیات (۲۰) طاعت نتواں کرد بہ امیدِ نجات
اے کاش زحق اشارتِ صوم و صلوٰۃ بودے بوجودِ مال، چوں حج و زکوٰۃ

کہتا ہے کہ بےمقدوری کی حالت میں جب کہ زندگی تلخ ہوتی ہے، نجات کی امید پر طاعت نہیں ہو سکتی۔ کاش ایسا ہوتا کہ جس طرح حج اور زکوٰۃ میں استطاعت اور تموّل شرط ہے، روزے اور نماز میں بھی یہی شرط ہوتی۔

شکایت ابنائے زماں

ہر چند زمانہ مجمعِ جہال ست (۲۱) در جہل نہ حالِ شاں بیک منوال ست
کودن ہمہ لیک از یکے تا دگرے فرقِ خرِ عیسیٰ و خرِ دجال ست

کہتا ہے کہ اگرچہ زمانے میں جس طرح جاہل بھرے ہوئے ہیں، مگر جہل میں ان کا حال متفاوت و مختلف ہے۔ کودن تو سب ہیں، مگر ایک دوسرے میں ایسا فرق ہے جیسا خرِ عیسیٰ اور خرِ دجال میں۔

میکش و جوہر

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم (۲۲) شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ میکش از ماست در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

یہ رباعی منشی جواہر سنگھ جوہر اور میرا احمد حسین میکش کے حق میں کہ دونوں مرزا کے عزیز شاگردوں میں سے تھے، لکھی ہے۔ در میکدہ پیریم یعنی پیرِ مغانیم۔ باقی رباعی کے معنی ظاہر ہیں۔

فخریہ

دستم بہ کلیدِ مخزنے مے بایست (۲۳) ور بود تہی، بدامنے می بایست
یا ہیچ گہہم بہ کس نیفتادے کار یا خود بزمانہ چوں منے می بایست

کہتا ہے کہ یا تو میرے ہاتھ میں کسی خزانے کی کنجی چاہیے تھی، اور اگر ہاتھ خالی ملا تھا تو اس میں کسی کا دامن ہونا چاہیے تھا، جس کے توسّل سے زندگی بسر ہوتی، یا مجھ کو کبھی کسی سے کام نہ پڑتا اور یا زمانے میں خود مجھ جیسا صاحب کمال ہوتا، جو میری قدر کرتا۔

امیدِ عفو

ہستم زِ نے امید سرمست و بس ست (۲۴) دلم سرِ ایں کلادہ در دست و بس ست
گر ارزشِ لطف و کرمے نیست، مباش! استحقاقِ ترحمے ہست و بس ست

سرِ ایں کلادہ یعنی سرِ ایں رشتہ۔ باقی معنی ظاہر ہیں۔

خطاب باغنیا

گر گرد زگنج گہرے برخیزد (۲۵) مپسند کہ دُود از جگرے برخیزد
منت نہ تواں نہاد بر گدیہ گراں بنشیں کہ بخدمت دگرے برخیزد

گنج گہر سے گرد اٹھنے کے معنی اس کے خالی ہو جانے کے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر جواہرات کا خزانہ خالی ہو جائے، تو بلا سے، مگر یہ گوارا مت کر کہ کسی کے جگر سے دھواں اٹھے۔ بھیک مانگنے والوں پر احسان نہیں رکھا جا سکتا۔ خدا نے ان کی خدمت پر تجھ کو کھڑا کیا ہے۔ اگر تجھ سے یہ خدمت پوری نہیں ہو سکتی تو بیٹھ جا، تاکہ دوسرا اس خدمت کے لیے اٹھے۔

عاشقانہ

اے دوست بشوی ایں فرومانده بیا (۲۶) از کوچۂ غیر راہ گردانده بیا
گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگ توام برگفتہ، خویش باش و ناخوانده بیا

اوپر کے دونوں مصرعے صاف ہیں۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ اے دوست، تو نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے مت بلانا، میں تیری موت ہوں۔ اچھا اب تو اپنے کہنے پر قائم رہ، اور جس طرح کہ موت بن بلائے آتی ہے، تو بھی بن بلائے چلا آ۔

اے آنکہ ہما اسیرِ دامت باشد (۲۷) صاف بہ خسروی بجامت باشد
تسبیح بہرِ اسم الٰہی کہ بود آغاز ز ابتدائے نامت باشد

یہ رُباعی سبحان علی خان مرحوم کو جو مرزا نے خط لکھا تھا، اس کے اوّل میں لکھی تھی. معنی ظاہر ہیں.

امیدبے،،

بازی خورِ روزگار بودم ہمہ عمر (۲۸) از بخت امیدوار بودم ہمہ عمر
بے مایہ بعسکرِ سُود ماندم ہمہ جا بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

خطاب با غنیا

باید کہ دلت ز غصہ برہم نہ شود (۲۹) از رفتنِ زر، دست خوش غم نہ شود
ایں سیم و زرست، خواجہ! ایں سیم و زرست غم نیست کہ ہر چند خوری، کم نہ شود

دست خوش، مغلوب و زیردست ۔ کہتا ہے کہ اے دولت مند! چاہیے کہ روپے کے کم ہو جانے سے تیرا دل پریشان اور غم میں دبا ہوا نہ رہے۔ اے حضرت، یہ سیم و زر ہے، اور پھر کہتا ہوں کہ سیم و زر ہے! یہ غم نہیں ہے کہ جس قدر کھائے جائیے، کم نہیں ہوتا۔

گرانی گوش

دارم دلِ شاد و دیدہ بینائے (۳۰) وز کرّیِ گوشم نہ بود پروائے
خوب ست کہ نشنوم ز ہر خود رائے گلبانگِ اَنَا رَبکم الاعلائے

کہتا ہے کہ مجھ کو کرّیِ گوش یعنی ثقلِ سماعت کی کچھ پروا نہیں، البتہ اس کو بہتر

سمجھتا ہوں کیوں کر مغرور اور خود پسندوں کی زبان سے أنا ربکم الاعلیٰ (جو کہ فرعون کا مقولہ ہے) نہیں سنتا۔

توحیدِ وجودی

اے کردہ بآرایشِ گفتار بسیچ (۲۱) در زلفِ سخن کشودہ راہِ خم و پیچ
عالم کہ تو چیزے گریش میدانی ذاتیست بسیطِ منبسط، دیگر ہیچ

بسیچ، قصد۔ زلفِ سخن میں خم و پیچ کی راہ کھولنے سے مراد بیان میں پیچیدگی پیدا کرنی۔ کہتا ہے کہ عالم جس کو تو نے کچھ چیز سمجھ رکھا ہے، وہ صرف ذاتِ واحد ہے، جو بسیط ہے۔ یعنی مرکب نہیں اور منبسط ہے یعنی تمام فضا میں پھیلی ہوئی ہے، بس اس کے سوا کچھ نہیں۔

شکایت

اے تیرہ زمیں کہ بودۂ بسترِ من (۲۲) ہر خاک کہ باتست، ہمہ بر سرِ من
زر بہرِ کساں و بہرِ من دانہ و دام اے مادرِ دیگراں و مادندرِ من

مادندر، سوتیلی ماں کو کہتے ہیں۔ زمین سے خطاب کرتا ہے کہ اوروں کے لیے تو تجھ پر سونا بچھا ہوا ہے اور میرے لیے دانہ و دام کے سوا کچھ نہیں؛ گویا تو اوروں کی ماں ہے اور میری میندر ہے۔ یہ مضمون تھوڑے تھوڑے فرق سے رودکی اور فرخی نے بھی باندھا ہے، مگر مرزا کے ہاں سب سے عمدہ طور پر بندھا ہے۔ رودکی کہتا ہے:

جہانا! چہ بینی تو از بچگاں کہ مادر گہے، گاہ مادندری

اور فرخی کہتا ہے،

بہر فرزندی بر خواجہ فگندہ ست جہاں ایں جہاں مادرِ او نیست کہ مادندرِ اوست

رسوائی

آزا کہ زدست بے زری پامال ست (۲۳) رسوائی نیز لازمِ احوال ست

ما خشک لبیم و خرقہ آلودہ بہ مے   ساقی مگرش پیالہ از غربال ست

کہتا ہے کہ مفلس آدمی کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ رسوا اور بدنام ہو۔ چناں چہ ہم کو دیکھ کر ہمارے ہونٹ تو خشک ہیں اور کپڑے شراب میں آلودہ ہیں۔ گویا ساقی کا جام چھلنی کا بنا ہوا ہے کہ منہ تک آتے آتے ساری شراب کپڑوں پر ٹپک جاتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ مفلس آدمی جو شراب پینے لگتا ہے وہ بہت جلد بدنام اور رسوا ہو جاتا ہے کیوں کہ کبھی کلال کی دکان پر جا کر ہاتھ پسارتا ہے، اور جو تھوڑی بہت مل جاتی ہے تو بدمست ہو کر اس کی دکان ہی پر یا راہ میں گر پڑتا ہے، آنے جانے والے سب اس کو دیکھتے ہیں۔ کبھی کلال کے دام چڑھ جاتے ہیں، تو اس سے بازار میں تکرار ہوتی ہے، اور سب لوگ دیکھتے ہیں۔ حالاں کہ کبھی اس کو اطمینان سے سیر ہو کر شراب پینی میسّر نہیں ہوتی۔ اس حالت کو اس تمثیل کے پیرایے میں بیان کیا ہے کہ گویا ساقیِ تقدیر ہم کو چھلنی کے پیالے میں شراب دیتا ہے کہ ہونٹ تک تو تر نہیں ہوتے اور کپڑے سارے شرابور ہو جاتے ہیں۔ ایسی بلیغ تمثیلیں بہت کم دیکھی گئی ہیں۔

علّت غائی جہنّم

اے دادہ بباد عمر در لہو و فسوس (۳۴) زنہار مشو ز رحمتِ حق مایوس

ہُشدار! کہ ز آتشِ جہنّم حق را   تہذیب غرض بود نہ تعذیبِ نفوس

فسوس، ہزل و استہزا۔ کہتا ہے کہ جہنم میں ڈالنے سے بندوں کو تکلیف دینی مقصود نہیں ہے، بلکہ جس طرح سونے کو آگ میں تپانے سے اس کی کھوٹ نکالنی مقصود ہوتی ہے، اسی طرح آتشِ جہنّم سے نفوسِ انسانی کو مہذّب کرنا مقصود ہے۔

شوخی

یارب تو کجائی کہ بہ ما زر نہ دہی (۳۵) بیدر د خدائی کہ بہ ما زر نہ دہی

بے مایہ چو مائی کر یہ مانند نہ دہی   نے نے، تو نہ غائبی و نے بیرحمی

اس رباعی میں مرزا کی شوخی و گستاخی حد سے زیادہ گزر گئی ہے۔ دارالافتا میں تو یقیناً اس پر کفر کا فتویٰ دیا جائیگا، لیکن ہمارے نزدیک ایسے کلام سے بجائے کفر کے زیادہ تر قائل کے ایمان اور یقین پر استدلال ہوتا ہے۔ صاف پایا جاتا ہے کہ سائل معاش کی تنگی و فراخی و خوش حالی و بد حالی کو محض خدا کی طرف سے جانتا ہے، اور تدبیر و عقل و دانش کو اس میں بالکل عاجز و درماندہ سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب معاش سے بہت تنگ ہوتا ہے تو یہ نہیں خیال کرتا کہ ہم نے تدبیر نہیں کی، یا تدبیر میں مجھ سے غلطی ہو گئی، یا ہماری کاہلی و سستی سے یہ تنگ دستی ہم کو نصیب ہوئی، بلکہ نہایت تعجب کے ساتھ خدا کی جناب میں عرض کرتا ہے کہ کیا تیرا خزانہ خالی ہو گیا ہے، جو ہم کو کچھ نہیں ملتا؟ ہاں، اس قسم کے خطابات آدابِ شریعت کے بالکل خلاف ہیں، اور ایسے ہی خطابات کی نسبت کہا گیا ہے:

ما بروں را ننگریم و قال را   ما دروں را بنگریم و حال را

قصائد

مرزا کے قصائد، جن میں قطعات، نوحے، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس وغیرہ بھی شامل ہیں۔ کیا باعتبارِ کمیت اور کیا بلحاظ کیفیت کے ان کے اصنافِ نظم میں سب سے زیادہ ممتاز صنف ہے۔ اگرچہ مرزا کی غزل کا ایک معتدبہ حصہ متاخرین کے طبقے میں کسی بڑے سے بڑے نامور اور مسلم الثبوت استاد کی غزل سے گرا ہوا نہیں ہے، بلکہ اکثر کی غزل پر ہر ایک لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے

مگر اسی کے ساتھ غزلیات کا ایک دوسرا حصّہ ایسا بھی ہے جس میں تغزل کی شان یعنی عام فہم اور خاص پسند ہونا، بہت کم پایا جاتا ہے بخلاف قصیدے کے کہ اس میں قصیدے کی شان جیسی کہ ہونی چاہیے، اوّل سے آخر تک یکساں طور پر جلوہ گر ہے۔

قصائد میں مرزا نے کہیں خاقانی کا تتبع کیا ہے، کہیں سلمان وظہیر کا، اور کہیں عرفی ونظیری کا؛ اور ہر ایک منزل کامیابی کے ساتھ طے کی ہے۔ مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی رتبہ ہوتی ہے اور اسی سے قصیدے کی پستی وبلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مشرقی شاعری میں عموماً اور ایران کی شاعری میں خصوصاً کوئی مضمون مدح وستایش سے زیادہ پھیکا، سیٹھا، ٹھنڈا اور بے لطف نہیں ہوتا، علی الخصوص متاخرین نے مبالغہ کی لَے کو بڑھاتے بڑھاتے مدح کو ہجو کے درجے تک پہنچا دیا ہے اور اس کلیے سے مرزا کی مدح بھی مستثنیٰ نہیں۔ البتہ عرفی نے مدحیہ مبالغوں میں ایک قسم کا بانکپن پیدا کیا ہے، جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس طرح قدما کے قصائد میں وہ آن نہیں پائی جاتی، اسی طرح مرزا کے قصائد بھی اُس سے معرا ہیں۔ لیکن مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیبیں کچھ شک نہیں کہ عرفی کی تشبیبوں سے سبقت لے گئی ہیں۔

چوں کہ مرزا کے تمام قصائد اور ان کے ملحقات کے انتخاب کی اس مختصر میں گنجائش نہیں ہے، اس لیے ہم ایک آدھ پورا قصیدہ اور باقی صرف چند تشبیبیں اور ایک آدھ مدح اور کچھ قطعے اور نوحے بطور نمونے کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور اخیر میں مرزا کا ایک ترکیب بند نظیری کے ترکیب بند کے ساتھ اس غرض سے نقل کریں گے تاکہ اصحابِ ذوقِ صحیح کو دونوں کے کلام میں موازنہ اور اس بات کا اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ مرزا نے اکبری طبقے کے چیدہ اور برگزیدہ شعرا کے تتبع کو کس حد اور کس درجے تک پہنچایا تھا۔

توحید

انتخاب از قصیدۂ توحیدِ الٰہی

اے زوہمِ غیر غوغا درجہاں انداختہ — گفتہ خود حرفے و خود را در گمان انداختہ

دیدہ بیرون و درون از خویشتن پروانگہے — پردۂ رسم پرستش در میان انداختہ

نقش بر خاتم ز حرفِ بے صدا انگیختہ — شور در عالم ز حسنِ بے نشان انداختہ

چرخ را در قالبِ ابداع دَر وَا[1] ریختہ — خاک را بر نطعِ[2] پیدائی ستان انداختہ

عاشقاں در موقفِ دار و رَسَن وا داشتہ — غازیاں در معرضِ تیغ و سنان انداختہ

رنگہا در طبعِ اربابِ قیاس آمیختہ — نکتہ ہا در خاطرِ اہلِ بیان انداختہ

با چنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی — مردہ را از خویش دریا بر کران انداختہ

دوئی کو مُردے سے اور وحدت کو دریا سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح دریا مُردے کو باہر پھینک دیتا ہے، اسی طرح باوجود ہنگامۂ کثرت کے وحدت میں دوئی نہیں سما سکتی۔ بالکل نئی اور نہایت بلیغ تشبیہ دی ہے۔

نردبانے بستہ با دیوار کاخے در نظر — انتعاشے[3,4] دہ نہادِ این و آن انداختہ

رفتہ ہر کس تا قدمگاہے وز انجا خویش را — پایہ پایہ از فرازِ نردبان انداختہ

غم چو گیرد سخت منتواں شکوہ از دلدار کرد — بہرِ آسانی اساسِ آسمان انداختہ

گل چو ماند دیر، گردد بردلش بازار سرد[5] — بہرِ تجدیدِ طرب طرحِ خزان انداختہ

آتشے از روئے گلہائے بہار افروختہ — شعلہ در جانِ مرغِ صبح خوان انداختہ

دجلہ در ساغرِ معنی طرازاں ریختہ — رشحہ در کاسۂ دریا و کان انداختہ

جز بدیں آب آتشِ زردشت نتواں سرد کرد — کعبہ را جوئے بہشت از ناودان انداختہ

---

۱ معلق ۲ فرش ۳ چت ۴ چاؤ ۵ یعنی بازارش بعدل سرد گردد

جز بدیں الماس نتواں یافتنیں دُردانہ سُفت — رخنہ از اسلام در کیشِ مغاں انداختہ

یعنی آتشِ زردشت ہر ایک پانی سے نہیں بجھ سکتی تھی، اس لیے میزابِ کعبہ سے بہشت کی نہر جاری کردی اور کیشِ مغاں ایک ایسا موتی تھا کہ اسلام جیسے الماس کے سوا اس کا بیندھنا، یعنی اس میں رخنہ ڈالنا ناممکن تھا۔

چشم[1] را بخشیدہ چوناں گردشے کارباب ہوش — بر زمیں مانندِ طرحِ آسماں انداختہ

دادہ ابرو را بدانساں جنبشے کاہلِ قیاس — در تنِ شمشیر پندار ند جاں انداختہ

ای ز شرمِ خاکسارانِ تو، از شہپر، ہما — چوں گلیمِ کہنہ ظل را برکراں انداختہ

ذوقِ تمکینِ گدایانِ تو، گنجِ شاہ را — از دلِ گنجور و چشمِ پاسباں انداختہ

تا دریں صورت ز چشمِ دشمناں پنہاں بود — دوست را اندر طلسمِ امتحاں انداختہ

تا علاجِ خستگی آسایشِ دیگر دہد — خارہا در رہگذارِ میہماں انداختہ

مرثیہ و نوحہ

منقبت از قصیدۂ سید الشہدا

کفرست کوزہ در پیِ روزی شاختن — ننگ ست ننگ، در غمِ دنیا گریستن

گاہے بداغِ شاہد و ساقی گداختن — گاہے بمرگِ مادر و بابا گریستن

باید بدرد ہرزہ گرستن، وگر گریست — بیجا گریستیم، دریغا گریستن!

رشک آیدم بہ ابر کہ در حدِ وسعِ اوست — بر خاکِ کربلا سے مُعلّا گریستن

رفت آنچہ رفت، بایدم اکنوں نگاہداشت — از بہرِ نورِ دیدۂ زہرا گریستن

یارانِ رحمتے اگر باید از شُست و شو[2] — دارد بہ رُوسیاہیِ اعدا گریستن

خود را ندیدزاں لبِ نوشیں بکامِ خویش — زیبد بہ شور بختیِ دریا گریستن

---

۱ یعنی چشمِ معشوقاں — ۲ یعنی بقصدِ شُست و شوی۔

مزد و شفاعت و صلا، صبر و خونبہا — ہیچ از کسے نخواستہ اِلّا گریستن
چوں رزقِ غیب درد ترا عام کردہ اند — سرمی زند ز مومن و ترسا گریستن

نوحہ

اے فلک! شرم از ستم بر خاندانِ مصطفیٰ — داشتی زیں پیش سر بر آستانِ مصطفیٰ
اے بمہر و ماہ نازاں! ہیچ میدانی، چہ رفت — از تو بر چشم و چراغِ دُودمانِ مصطفیٰ
سایہ از سرو روانِ مصطفیٰ افتد بخاک — ہاں، چہ برخاک افگنی سروِ روانِ مصطفیٰ
گرمیِ بازارِ امکان خود طفیلِ مصطفیٰ است — بیں، چہ آتش میزنی اندر دکانِ مصطفیٰ
کینہ خواہی بیں کہ با اولادِ امجادش کنی — آنچہ با مرکردہ اعجازِ بنانِ مصطفیٰ
نیک بود گر تو بر فرزندِ دلبندش ردد — آنچہ رفت از مرتضیٰ بر دشمنانِ مصطفیٰ
یا تو دانی مصطفیٰ را فارغ از رنجِ حسین — یا تو خواہی زیں مصیبت امتحانِ مصطفیٰ
یا مگر گاہے ندیدی مصطفیٰ را با حسین! — یا مگر ہرگز نبودی در زمانِ مصطفیٰ
آں حسین ست اینکہ گفتے مصطفیٰ "روحی فداک" — چوں گذشتے نامِ پاکش بر زبانِ مصطفیٰ
آں حسین ست اینکہ سودے مصطفیٰ چشمش بہ رخ[2] — بوسہ چوں باقی نماندے در دہانِ مصطفیٰ
قدسیاں را نطق من آوردہ غالب! در سماع — گشتہ ام در نوحہ خوانی مدح خوانِ مصطفیٰ

نوحہ

اے کج اندیشہ فلک! حرمتِ دیں بایستے — عَلَمِ شاہ نگوں شد، نہ چنیں بایستے
تا چہ افتاد کہ بر نیزہ سرش گرداند — عزتِ شاہِ شہیداں بہ ازیں بایستے
حیف باشد کہ فتد خستہ ز توسن برخاک — آں کہ جولانگہِ او عرشِ بریں بایستے
حیف باشد کہ ز اعدا دمِ آبے[3] طلبد — آنکہ سائل بدرش روحِ امیں بایستے

انتقام کشی — ۲ یعنی چشم برخش — ۳ جرعۂ آبے

تازیاں را بہ جگر گوشۂ احمد چہ نزاع | وطنِ اصلیِ ایں قوم رچیں بایستے
ایہاالقوم! تنزل بود ار خود گویم | میہماں بے خطر از خنجرِ کیں بایستے

یعنی یہ تو ادنی درجے کی بات ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ اہلِ شام کربلا کا میہماں خنجرِ کیں سے محفوظ رہنا چاہیے تھا، بلکہ جو سخن اس موقع پر کہنے کے لایق ہے، وہ یہ ہے یعنی جیسا کہ اگلے اشعار میں بیان ہوا ہے۔

سخن اینست کہ در راہِ حسینؑ ابن علیؑ | پویہ از رُوے عقیدت بہ جبیں بایستے
چشم بد دور، بہ ہنگامِ تماشاے رُخش | رُو نما سلطنتِ رُوی زمیں بایستے
داشت ناخواستہ در شکر قدومش دادن[سہ] | اگرش ملک دگر تاج و نگیں بایستے
چوں بفرمانِ خود آرائی و خود بینی و بغض | آں بکرد بدکہ از صدق و یقیں بایستے
یا اسیرانِ ستمدیدہ پس از قتلِ حسین | دلِ نرم و منشِ مہر گزیں بایستے
چہ ستیزم بقضا، ورنہ بگویم، غالب! | عَلَمِ شاہ نگوں شد، نہ چنیں بایستے

نوحہ

وقت ست کہ در پیچ و خم نوحہ سرائی | سوزد نفسِ نوحہ گر از تلخ نوائی
وقت ست کہ آں پردگیاں، کز رہِ تعظیم | بر درگہِ شاں کردہ فلک ناصیہ سائی
از خیمۂ آتش زدہ عریاں بدر آیند | چوں شعلہ دُخاں بر سرِ شاں کردہ ردائی
جانہا ہمہ فرسودۂ تشویش اسیری | دلہا ہمہ خوں گشتۂ اندوہ رہائی
اے چرخ! چو آں شد، دگر از بہر چہ گردی؟ | اے خاک! چو ایں شد، دگر آسودہ چرائی؟
خوں گرد فرو ریز، اگر صاحبِ مہری | برخیز و بخوں غلط، گر از اہلِ وفائی
تنہاست حسین ابن علی در صفِ اعدا | اکبر! تو کجا رفتی و عباس! کجائی؟

سہ دادن داشت بمعنی می بایست داد

توقیعِ شفاعت کہ پیمبر ز خدا داشت
از خونِ حسین ابنِ علی یافت روائی

فریاد ازاں حاملِ منشورِ امامت!
فریاد ازاں نسخۂ اسرارِ خدائی!

فریاد ازاں زاری و خونابہ فشانی!
فریاد ازاں زاری و بے برگ و نوائی!

فریاد ز بیچارگی و خستہ درونی!
فریاد ز آوارگی و بے سر و پائی!

غالب! جگرے خوں کن و از دیدہ فروبار
گر ردے شناسِ غمِ شاہِ شہدائی

نوحہ

سروِ چمنِ سروری افتاد زپا، ہاے
شد غرقہ بخوں پیکرِ شاہِ شہدا، ہاے!

بر خاکِ رہ افتادہ تنے ہست سرش کو
آں روے فروزندہ وآں زلفِ دوتا، ہاے!

عباس دلاور کہ دراں راہروی داشت
شمشیر بیک دست و بیک دست لوا، ہاے!

آں قاسمِ گلگوں کفنِ عرصۂ محشر
واں اکبرِ خونیں تنِ میدانِ وغا، ہاے!

آں اصغرِ دل خستۂ پیکانِ جگر دوز
واں عابدِ غمدیدۂ بے برگ و نوا، ہاے!

اے قوتِ بازوے جگر گوشۂ زہرا!
دستِ تو بشمشیرِ شد از شانہ جدا، ہاے!

اے شہرہ بدامادی و شادی کہ نداری
کافورِ کفن بگذرم از عطر و قبا، ہاے!

اے مظہرِ انوار کہ بود اہلِ نظر را
دیدارِ تو دیدارِ شہِ ہر دو سرا، ہاے!

اے گلبنِ نو رستۂ گلزارِ سیادت
نایافتہ در باغِ جہاں نشو و نما، ہاے!

اے منبعِ آں ہشت کہ آرایشِ خلد اند
واغم کہ رسن شد بگلوے تو ردا، ہاے!

با لغ نظرانِ روشِ دینِ نبی حیف!
قدسی گہرانِ حرمِ شیرِ خدا، ہاے!

ماتم کدہ آں خیمۂ غارت زدگاں حیف!
غارت زدہ آں قافلۂ آلِ عبا، ہاے!

آں تابشِ خورشید، دراں گرم روی، حیف!
واں طعنۂ کفار دراں شورِ عزا، ہاے!

غالب! بملائک نتواں گشت ہم آواز
اندازہ آں کو کہ شوم نوحہ سرا، ہاے!

قصیدۂ ضریحیہ

بیا در کربلا، تا آں ستمکشِ کارواں بینی
کہ در دے آدم آلِ عبا را ساربان بینی

نہ بینی ہیچ بر سرِ خازنانِ گنجِ عصمت را
مگر در خارِ بن[1] ہا تار و پودِ طیلساں[2] بینی

ہما نا سیلِ آتش بردہ بنگاہِ غریباں را
کہ ہر جا پارۂ از رخت سوختہ از دخاں بینی

بہ بینی چشمۂ از آب و چوں جوئی کنارش را
ز خونِ کشتہ کاماں چشمۂ دیگر رواں بینی

بہ بینی سرخوشِ خوابِ عدم عباسِ غازی را
نہ مشکش در خمِ بازو، نہ تیرش در کماں بینی

ہجومِ خستگان و سوز و سازِ نو گرفتاراں
نوا بیں بزمِ طوے قاسمِ ناشادماں بینی

نمی بینی کہ چوں جاں داد از بیدادِ بد خواہاں
علی اکبر کہ ہمچوں بختِ بدخواہش جواں بینی

گر فہم کایں ہمہ بینی دلے داری و چشمے ہم
بخوں آغشتہ نازک پیکرِ اصغر چساں بینی؟

چہ دنداں در جگر افشردہ باشی کاندراں وادی
حسین ابن علی را در شمارِ کشتگاں بینی

نیاری گرد راں کوشی کہ پایش در رکاب آری
نہ بینی گر خود آں خواہی کہ گردش بر عناں بینی

تنے را کش رگِ گل خار بودے، بر زمیں یابی
سرے را کش ز افسر عار بودے بر سناں بینی

ستایشِ روزگار

تشبیب قصیدۂ منقبتِ امامِ دوازدہم

ہست از تمیز گر بہ ہما استخواں دہد
آئینِ دہر نیست کہ کس را زیاں دہد

مردِ ست مرد، ہر چہ کند بے خطر کند
را دست راد[3]، ہر چہ دہد رایگاں[4] دہد

گلزار را اگر نہ ثمر، گل بہم نہد
درویش را اگر نہ سحر، شام ناں دہد

گنجِ سخن نہد بہ نہاں خانۂ ضمیر
و انگہ کلیدِ گنج بدستِ زباں دہد

تا روز خاک تیرہ نگردد ز رشکِ چرخ
رخشانی ستارہ بریگِ رواں دہد

---

۱ جھاڑیاں ۲ چادر ۳ فیاض ۴ مفت

تا آدمی ملال نہ گیرد زیک ہوا ‌ ‌ ‌ ‌ سرما و نوبہار و تموز و خزاں دہد
ہم در بہار گل شگفاند چمن چمن ‌ ‌ ‌ ‌ تا راحتِ مشام و نشاطِ رواں دہد
ہم در تموز میوہ فشاند طبق طبق ‌ ‌ ‌ ‌ تا آرزوے کام و مرادِ دہاں دہد
آں را کہ طالعِ کفِ گنجینہ پاش نیست ‌ ‌ ‌ ‌ طبعِ سخن رس و خردِ خردہ داں دہد
آں را کہ بختِ دسترس بذلِ مال نیست ‌ ‌ ‌ ‌ نعم البدل زخامۂ پردیں فشاں دہد
دانم کہ آسماں بہ زمیں پیشکارِ کیست ‌ ‌ ‌ ‌ عکسِ چہ جلوہ روشنیِ روشناں دہد
چوں جنبشِ سپہر بفرمانِ داور ست ‌ ‌ ‌ ‌ بیداد نہ بود، آنچہ بما آسماں دہد
رنگ از گل ست و سایہ ز نخل و نوا ز مرغ ‌ ‌ ‌ ‌ ہر جا بہار، ہر چہ بود در خورِ آں دہد
در شرِ نغمہ، قرعہ بنامِ ہوا زند ‌ ‌ ‌ ‌ در نشوِ سبزہ، حکم بہ آبِ رواں دہد
مستیز با نسیم، اگر بلبلے بہ باغ ‌ ‌ ‌ ‌ جاں در نوردِ خار و خسِ آشیاں دہد
دارو ز بہرِ زندگی آمد، نہ بہرِ مرگ ‌ ‌ ‌ ‌ جرمِ پزشک[2] چیست اگر خستہ جاں دہد
پرویز دیر یاب شہے بود، ورنہ بخت ‌ ‌ ‌ ‌ آوارہ را براہ ز شیریں نشاں دہد
فرہاد زود میر کسے بود، ورنہ دہر ‌ ‌ ‌ ‌ کامِ دلِ غریب پس از امتحاں دہد
دارم ز روزگار نویدے کہ آں نوید ‌ ‌ ‌ ‌ در پیریم بشارتِ بختِ جواں دہد
از داورِ زمانہ[3] باندیشہ درست ‌ ‌ ‌ ‌ شادم کہ مژدِ بندگیم ناگہاں دہد
برگر بسرنوشت سر آید شمارِ غم ‌ ‌ ‌ ‌ راہم ببارگاہِ شہِ انس و جاں دہد
سلطانِ دیں محمد مہدی کہ راے او ‌ ‌ ‌ ‌ منشورِ روشنی بہ شہِ خاوراں دہد

صفتِ سالکانِ طریقت

تشبیب قصیدۂ مدح بہادر شاہ مرحوم

رہروانِ[4] چوں گہرِ آبلہ پا بینند ‌ ‌ ‌ ‌ پاے را پایہ فرازش[5] ز ثریا بینند

---

۱ ستارگان ‌ ‌ ۲ طبیب ‌ ‌ ۳ مراد از داورِ زمانہ: خود زمانہ ‌ ‌ ۴ سالکان ‌ ‌ ۵ بالاتر

ہر چہ در دیدہ عیانست، نگاہش دارند ۔۔۔ ہر چہ در سینہ نہانست، ز سیما بینند

راستی از رقم صفحۂ ہستی خوانند ۔۔۔ نقشِ کج بر ورقِ صفحۂ عنقا بینند

یہ شعر گویا ماحصل ہے اس قول کا کہ "لیس فی الامکانِ اَبدَاَع مما کان" یعنی جو نظامِ عالم کہ اب موجود ہے، اس سے بہتر نظام ناممکن تھا۔

دور بینانِ ازل، کوریِ چشمِ بدبین[2] ۔۔۔ ہم دریں جا نگرند آنچہ در آنجا بینند

راز زیں دیدہ دراں جوے کہ از دیدہ وری ۔۔۔ نقطہ گر در نظر آرند، سویدا بینند

راہ زیں گرم رواں پرس کہ در گرم روی ۔۔۔ جادہ چوں نبض تپاں در رگِ صحرا بینند

شررے را کہ بناگاہ بدر خواہد جست ۔۔۔ زخمۂ کردار بتارِ رگِ خارا بینند

قطرۂ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست[3] ۔۔۔ صورتِ آبلہ بر چہرۂ دریا بینند

شام در کوکبۂ صبح، نمایاں نگرند ۔۔۔ روز در منظرِ خفاش، ہویدا بینند

وحشتِ تفرقہ در کاخِ مصوّر سنجید ۔۔۔ مجمعِ اُنس بہ نے بست زلیخا بینند

کاخِ مصوّر وہ محل جس کو زلیخا نے وصالِ یوسف کے لیے آراستہ کیا تھا اور جس میں تمام سامانِ عیش و کامرانی جمع تھا۔ نے بست وہ جھوپڑا جو یوسف کے قید ہو جانے پر ان کی جدائی کے غم میں زلیخا نے اپنے لیے بنایا تھا اور اس میں رہتی تھی۔ کہتا ہے کہ یہ لوگ یعنی اہل اللہ کاخِ مصوّر جیسے آراستہ محل میں، اس تفرقہ کی وحشت کو دیکھ لیتے ہیں، جو یوسف اور زلیخا کے حق میں وہاں سے آخر کار پیدا ہوا اور اُنس اور طلاپ کو اس نے بست میں دیکھ لیتے ہیں جو یوسف اور زلیخا کو اس کے بعد نصیب ہونے والا تھا۔

ہر چہ گوید عجم از خسرو و شیریں شنوند ۔۔۔ ہر چہ آرد عرب از وامق و عذرا بینند

یعنی آں بنظرِ غور بینند ۔۔۔ ۲ یعنی چشمِ بد دور ۔۔۔ ۳ یعنی گہر خواہد شد

یعنی خسرو و شیریں کا قصہ جو اہلِ عجم بیان کرتے ہیں، یہ لوگ خود اس کو خسرو اور شیریں کی زبان سے سن لیتے ہیں اور وامق و عذرا کی روئیداد جو عرب والے بیان کرتے ہیں، یہ لوگ خود اس کو وامق و عذرا پر گزرتی دیکھ لیتے ہیں۔

نستو ہند اگر ہمرہِ مجنوں گردند نخروشند اگر محمل لیلےٰ بینند
خوں خورند و جگر از غصہ بدنداں گیرند خویش را چوں بسر مائدہ تنہا بینند

یعنی جب ان کے ساتھ کوئی دوسرا دستر خوان پر نہیں ہوتا، تو دانت پیستے ہیں یعنی جو فیض ان کو پہنچتا ہے، اس میں اوروں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔

سر و تن را اگر از درد ستوہ انگارند جان و دل را اگر از دوست شکیبا بینند
قطرۂ آب بہ لب بوسۂ نشتر شمرند پارۂ ناں بہ گلو ریزۂ مینا بینند

یہ دونوں شعر دست و گریباں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دردِ طلب سے اکتا جانا اور دوست کے خیال سے فارغ ہونا کبھی نہیں چاہتے۔

قشقہ را رونقِ ہنگامۂ ہندو خوانند بادہ را شمع طرب خانۂ ترسا بینند

یعنی ہر ایک شے کو اپنے اپنے محل پر مناسب و موزوں خیال کرتے ہیں اور کسی چیز سے ازراہِ تعصب ناک نہیں چڑھاتے۔

بَرسَم و زمزمہ و قشقہ و زنّار و صلیب خرقہ و سُبحہ و مسواک و مصلےٰ بینند

برسم و زمزمہ آتش پرستوں کے ساتھ، قشقہ و زنّار ہندوؤں کے ساتھ، اور صلیب عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہے، اور دوسرے مصرعے میں شعائرِ اسلام کا بیان ہے۔ کہتا ہے کہ وہ لوگ برسم و زمزمہ وغیرہ اور خرقہ و مصلےٰ وغیرہ میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔

طی نہ بینند بہ نیرنگ و دریں دیرِ دو رنگ ہر چہ بینند بہ عنوانِ تماشا بینند
جام جویند و ز رندی نگرایند بہ زہد سبحۂ انجم اگر در یدِ بیضا بینند

ہر چہ در سُو نہ تواں یافت، بہ ہر سو یابند　　ہر چہ در جا نتواں دید، بہمہ جا بینند
ہمہ گردند دراں پایہ کہ اُو را دانند　　ہیچ باشند دراں وقت کہ خود را بینند

اشعارِ فخریہ

ایں نظر ہائے گرانمایہ فراموش کنند　　چوں بہ نیرنگِ سخن شعبدۂ ما بینند
نظم را موجۂ سرچشمۂ حیواں فہمند　　نثر را نسخۂ اعجازِ مسیحا بینند
گر پے نقل بصد گونہ تقاضا خواہند　　گر پے فال بصد رنگِ تمنا بینند
بُرد از یاد کہ دنیاست نمودِ بے بود　　ایں دل افروز نمودے کہ ز دنیا بینند

اس مقام پر اس شعر کی خوبی و جدانی ہے، بیان میں نہیں آسکتی۔ کہتا ہے کہ دنیا کی یہ دل افروز نمود یعنی ہماری نظم و نثر جب اہل اللہ کی نظر سے گزرے گی، تو وہ ان کے دل سے اس عارفانہ خیال کو فراموش کردے گی کہ دنیا محض ایک نمودِ بے بود ہے۔

صفتِ موسمِ بہار

تشبیب قصیدۂ مدح ملکہ معظمہ

شکر کہ آشوب برف و باد سر آمد　　نامیہ از بندِ زمہریر بر آمد
کسب ہوا نفع آبِ خضر رساند　　سبزہ جہاں را بہ بیشہ راہبر آمد

یعنی آج کل جنگل کی ہوا کھانے سے وہی فائدہ ہوتا ہے، جو آبِ حیات کے پینے سے ہوتا ہے؛ اور جس طرح خضر آبِ حیات کا رستہ بتاتا ہے، اسی طرح سبزہ جنگل کا رستہ بتاتا ہے۔

در چمنستاں کشودہ بارِ نوادر[5]　　باد کہ بازارگانِ[6] بحر و بر آمد

۱۔ جہت　۲ مکان　۳ یعنی ایں ملاحظات کہ بالا مذکور شد　۴ آبِ حیواں　۵ نفائس
۶ سوداگر

اُشتلمِ[1] انتظارِ گل بود، ارنہ[2] — دیدۂ نرگس ز حدقہ چوں بدر آمد

تا زچہ[3] دانستہ قربِ مقدمِ گل را — سبزہ بہ باغ از شگوفہ بیشتر آمد

یعنی سبزہ جو شگوفے سے پہلے آیا ہے، اس نے گل کی آمد آمد کہاں سے سُن لی۔

بیہدہ[4] نبود خروشِ مرغِ سحرخواں — کوکبۂ[5] گل مگر[6] بباغ درآمد

قیس کجا تا کند شمارۂ محمل — از پسِ ہر غنچہ غنچہ دگر آمد

غنچے کو محمل سے اور گل کو لیلیٰ سے تشبیہ دی ہے۔ کہتا ہے کہ قیس جو ایک کے سوا دوسرا محمل نہیں جانتا، وہ آئے اور محملوں کو شمار کرے کیوں کہ ہر غنچے کے بعد دوسرا غنچہ اور دوسرے کے بعد تیسرا دَھم جڑا نکلتے چلے آتے ہیں۔

کثرتِ انواعِ گل بنگر کہ ہیولےٰ — رنجہ زبارِ فزونیِ صُوَر آمد

یعنی طرح طرح کے پھولوں کی اس قدر کثرت ہے کہ ہیولیٰ بے شمار مختلف صورتوں کی بہتات سے عاجز آگیا ہے اور تھک گیا ہے۔

لالہ بسیچد ز تیغِ کوہ گزشتن — دامنش اینک ز زیرِ سنگ برآمد

بسیچد یعنی ارادہ کرتا ہے۔ تیغِ کوہ، قلّۂ کوہ؛ دامن از زیرِ سنگ برآمدن مصیبت سے نجات پانا۔

نکہتِ گل شد وبالِ عامِ جُعَل را — زنجرہ ہر شب نہ ہرزہ مویہ گر آمد

جُعَل ایک جانور ہے، سیاہ رنگ جس کو خوشبو راس نہیں؛ اسی لیے موسمِ بہار میں مر جاتا ہے اور چوں کہ گوبر میں پیدا ہوتا ہے، اس لیے اس کو ہندی میں گبریلا کہتے ہیں۔ زنجرہ، جھینگر جو رات کو اکثر بولتا ہے۔ مویہ گر، نالاں و گریاں۔

میکدۂ خسروِ گل ست اُرزستاں — صورتِ مینا ز غورہ در نظر آمد

---

۱ شدت ۲ ورنہ ۳ چرا ۴ یعنی بے وجہ ۵ سواری ۶ شاید

کہتا ہے کہ رزستان یعنی انگور کی ٹٹیاں گویا خسروِ گل کا شراب خانہ ہے
کیوں کہ اس میں نیم خام انگور لگے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے شراب کی بوتلیں۔

رَو، غمِ تر دامنی مخور کہ جہاں را	موجِ گل از سر کرانہ تا کمر آمد
فتوئ بحلِ مَے داد ابر و باد و لیکن	شیشہ نہاں بہ کہ ژالہ بدگہر آمد

از تشبیب قصیدۂ مدحیۂ ملکۂ معظمہ

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں امن ہو جانا اور معافی کا اشتہار جاری ہونا

در روزگار ہا نتواند شمار یافت	خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت
پرکار تیز کرد فلک در میاں ببیں	حق داد دادِ حق کہ بمرکز قرار یافت
دَرہائے آسماں بہ زمیں باز کردہ اند	ہر کس ہر آنچہ جُست، بہ ہر روزگار یافت
آمد اگر بفرض زبالا بلا فرود	بر روئے خاک پیچ و خمِ زلفِ یار یافت
چوں حسنِ ماہ یک شبہ بینی، بداں کہ ماہ	پاداشِ جانگدازیِ شبہائے تار یافت
چوں رنگِ روئے گل نگری، شاد شو کہ گل	اجرِ جگر خراشیِ پیکانِ خار یافت
در خاک و باد آتش و آب آشتی فزود	ایں پرورش کہ خلق ز پروردگار یافت
ناچار جزء داد گرایش نمی کند	در دہر ہر چہ صورت ازیں ہر چہار یافت
ہر کس بقدرِ فطرتِ خویش ارجمند گشت	ہر شے بحسنِ جوہرِ خویش اشتہار یافت
گر خواجہ بندہ را خطِ آزادگی نبشت	ہم بردرِ سرائے خودش بندہ وار یافت
ور بندہ خود ز خشم خطِ بندگی درید	توقیعِ خوشدلی ز خداوندگار یافت
مہ روشنی و مہر فروزش ز سر گرفت	لیل و نہار صورتِ لیل و نہار یافت
بہرام دل بہ بستنِ تیغ و کمر نہاد	ناہید ذوقِ ورزشِ مضراب و تار یافت
نظارہ فتنہ ہائے عیاں از نظر سترد	اندیشہ گنجہائے نہاں آشکار یافت

ــــ یعنی چشم

جام از شراب روشنیِ آفتاب داد — بزم از بساطِ تازگیِ نوبہار یافت

روے سخن صفاے بناگوشِ گل گزید — بانگِ قلم نشاطِ نواے ہزار[1] یافت

برہم زدند قاعدہ ہاے کہن بہ دہر — ہر کس نشاطِ تازہ زہر گونہ کار یافت

فیضِ سحر بہ غالبِ پیمانہ کش رسید — ذوقِ صبوح عابدِ شب زندہ دار یافت

رہزن متاعِ خویش بر ابن السبیل ریخت — کودک رضاے لہو ز آموزگار یافت

گر زاہد ست نیز ز من مے بجام بُرد — ور مجرم ست نیز ز شحنہ زینہار یافت

با فتنہ ہم مضائقہ در خرمی نرفت — خود رختِ خوابش از رگِ گل پود و تار یافت

دولت سپند سوخت کہ شد ملک تازہ روے — ملک آفریں سرود کہ دولت مدار یافت

از انتظامِ شاہی و آئینِ سروری — شورِ سرود و دانش و داد انتشار یافت

برخستگانِ ہند بہ بخشود از کرم — وکٹوریا کہ رونق ازو روزگار یافت

شکوۂ تغافل و عدمِ توجہ نواب یوسف علی خان مرحوم رئیسِ رامپور در زمانۂ سختی و بے نوائی کہ بعد از فتحِ دہلی روزے چند رُوے دادہ بود

چوں نیست مرا شربتِ آبے ز تو حاصل — دانم کہ تو دریائی و من سبزۂ ساحل

در بادیہ بر گورِ غریباں زچہ سوزد — آں شمعِ فروزاں[2] کہ بود درخورِ محفل

زاں خسروِ خوباں چہ قدر چشمِ وفا بود[3] — صد حیف کہ شد نقشِ امیدم ہمہ باطل

---

۱ بلبل ۲ یعنی من ۳ نواب یوسف علی خان مرحوم صاحبزادگی کے زمانے میں جب تحصیلِ علم کے لیے دلّی میں آئے تھے اس وقت مرزا صاحب سے بہت ربط تھا۔ مفتی صدرالدین خان مرحوم سے عربی پڑھتے تھے اور مرزا صاحب سے فارسی۔ مرزا نے اس قصیدے میں اس زمانے کو یاد دلایا ہے۔ چنانچہ اسی قصیدے پر نواب ممدوح نے سو روپیہ ماہوار مرزا کے لیے مقرر فرمایا تھا، جو مرزا کے دمِ واپسیں تک برابر جاری رہا۔

افسانۂ غم گر بسرایم، نبود عیب — با دوست کہ پیوستہ ہمی بُرد غم از دل
میگویم و ہمدم زندم طعنہ کہ تن زن[1] — چوں می نہ دہد داد، ز فریاد چہ حاصل
از طعنہ شدم خستہ دل و از رہِ تیمار[2] — دل گفت کہ ہاں، شیوۂ عشّاق فرو ہل
تا کس نبرد ظن کہ بہ شاہد بودم رُوے[3] — حاشا کہ حکایت کنم از لیلیٰ و محمل[4]
شاہد بود آں دوست کہ اندر غزل اورا — خوانند ستمگارہ و خونخوارہ و قاتل
من نالم ازاں دوست کہ در عالمِ انصاف — شایاں بودش، گویم اگر، خسروِ عادل
او خسروِ خوباں بود و بندہ گدایش — او قلزم و عماں بود و من خسِ ساحل
خود ہر چہ سرودم ہمہ با اوست کزیں پیش — امید کہم بود بہ ہر وادی و منزل
یارب! چہ شد اینک کہ نگیرد خبر از من — بربستہ بروئیم درِ ارسالِ رسائل
اے یوسفِ ثانی کہ بود در ہمہ عالم — مشتاقِ جمالِ تو چہ دیوانہ، چہ عاقل
تا نزدِ تو چوں آیم و دور از تو چہ سازم — ماندن[5] ز تو دشوار و رسیدن بہ تو مشکل
اے کاش، بکوے تو چنیں رُوے نمودے — زینساں کہ فرو رفتہ مرا پای دریں گِل[6]
چوں ست کہ گاہے نکنی رُوے بدیں سُوے؟ — از چیست کہ ہرگز نہ دہی داد[7] بسائل
گر جاں دہم از غصہ، تو دانی کہ بگیتی — حرفے غلط از صفحۂ ہستی شدہ زائل
خواہی کہ مرا بنگری، از دور بفرمائے — تا نزدِ تو آرند یکے طائرِ بسمل
از صنعتِ استادِ ازل داں کہ ز ہر سُوے — چوں قبلہ نما سُوے توام ساختہ مائل

---

۱ خاموش باش ۲ غم خواری ۳ یعنی روے سخن

۴ چوں کہ تشبیب میں اکثر معشوق کی طرف خطاب ہوتا ہے، اس لیے کہتا ہے کہ میں اس تشبیب میں لیلیٰ و محمل کا ذکر نہیں کرتا یعنی معشوق کی طرف میرا روے سخن نہیں ہے۔

۵ یعنی از لقاے تو واماندن ۶ یعنی در وطنِ خود ۷ دریوزہ

غالب بسخن نامِ من آمد، ازل آورد[1] — دانی کہ دریں شیوہ نیم عامی و جاہل
درفنِ سخن دم مزن از عرفی و طالب — ایں آیۂ خاص ست کہ برمن شدہ نازل
من گنجم و گردوں زگل اندودہ دَرم[2] را — می بیں درِ گنج، ارچہ کشودن شدہ مشکل
خود درخورِ ویرانہ بود، گنجِ گراں مند[3] — غم نیست گر آبادیِ دہلی شدہ زائل
ہاروت، فسونِ نفسِ گرم چہ داند — اعجاز زدہلی بود و سحر ز بابل
آں را کہ صریرِ قلمم ہوش رُباید — دیگر بزد ذوق زآوازِ عنادل
توقیعِ بریلی[4] بہ تو فرخندہ کہ من نیز — بستم بہ فرہ مندیِ[5] خویش از کرمت دل
حاشا کہ ستانم رقمِ قاضی و مفتی[6] — حاشا کہ پذیرم عملِ شحنہ و عامل
لیفرست خردمندکساں را بحکومت — درجیب گدا ریز قلیلے زمداخل
ہر سال ازاں شہر بمن دایہ رواں دار — کز بہرِ ہمیں گشتہ در اقطاعِ[8] تو شامل
امید کہ لب تشنگیِ من نہ پسندی — زاں رشحہ کہ برصفحہ فشانی ز اَنامل

زاں رشحہ یعنی مداد۔ مطلب یہ کہ میرے ساتھ خط وکتابت جاری رہے۔

امید کہ بپزیری و برمن نہ کنی قہر — نپذیرم اگر معذرتِ فرطِ مشاغل
امید کہ اں شیوہ نورزی کہ نگویم — کز دردِ دلم فارغ واز من شدہ غافل

کیفیتِ آغازِ موسمِ سرما

تشبیب قصیدۂ مدح نواب وزیرالدولہ رئیس ٹونک

عیدِ اضحےٰ بسرِ آغازِ زمستاں آمد — وقتِ آراستنِ حجرہ و ایواں آمد
گرمی از آب بروں رفت و حرارت زہوا — محملِ مہرِ جہاں تاب بہ میزاں آمد

---

۱ یعنی قدیم و ازلی ۲ یعنی میرے در کو تیغا کر دیا ہے ۳ گنجِ گراں بہا ۴ یعنی فرمانِ الحاقِ بریلی بہ رامپور ۵ اقبال مندی ۶ یعنی عہدۂ قاضی و مفتی نمیخواہم ۷ یعنی از ماصلات بریلی ۸ جاگیر

روز می کاہد و شب راست درافزایش روے / موسمِ دیر غنودن بہ شبستاں آمد

آذر افروز و خرد اطلس و سیفور بدوز / مہرمہ میرود، اینک مہِ آباں آمد

ہند در فصلِ خزاں نیز بہارے دارد / گونہ گوں سبزہ گُلی بندِ خیاباں آمد

دَے و بہمن کہ در اقلیمِ دگر یخ بندد / اندریں ملک گل و سبزہ فراواں آمد

نیشکر بسکہ صف آراست، کدیور[2] بہ نسیم / گفت جائیست دگر سرزدہ[3] نتواں آمد

نخلِ نارنج نہ بینی کہ ہم از میوہ و شاخ / گوی چوگاں بکف آورد و بمیداں آمد

تا بَرد داغِ غمِ ہجر شقائق زدلش / گلِ صدبرگ[5] بدلجوئیِ دہقاں آمد

گر نہ ایں گرمیِ ہنگامہ تماشا دارد / از چہ نرگس پےِ نظارہ بہ بستاں آمد

صفتِ موسمِ بہار

تشبیبِ قصیدۂ مدحیہ نرندر سنگھ سرگباشی رئیسِ پٹیالہ

سحر کہ بادِ سحر عرضِ بوستاں گیرد / دہد بہ نکہتِ گل حکم تا جہاں گیرد

براتِ[6] بر زرِ گل کردہ اند، پنداری / کہ غنچہ را سپہِ سبزہ درمیاں گیرد

مگر بگردِ گل از بہرِ پاس حلقہ زدہ است / کہ ژالہ را زہوا سبزہ برسناں گیرد

ستادہ سروِ بداں اہتمام بردرِ باغ / کہ تا بہارِ دگر راہ برخزاں گیرد[8]

زژالہ غنچہ بہ سرمست شاہدے ماند / کہ بعدِ بادہ شکر ریزہ در دہاں گیرد

چمن زعکسِ شفق ساتکینِ مُل گردد / سمن زجوشِ طرب رنگِ ارغواں گیرد

زنند گر ہمہ آتش بہ خار، گل بالد / کشند گر ہمہ پیکر زسنگ جاں گیرد

زانبساطِ ہوا العجب ازیں عجب دارم / کہ مرغِ قبلہ نما جا در آشیاں[9] گیرد

---

۱ یعنی در دَے و بہمن ۲ باغبان و کاشتکار ۳ یعنی در آنا یا منہ اٹھائے۔ ۴ لالہ ۵ گیندا

۶ تنخواہ کی چٹھی ۷ محافظت ۸ مسدود سازد ۹ یعنی از آشیاں پرواز خواہد گیرد

زگل نگہ نتواں داشت دل، بحیلۂ عشق — اگر زما نتواند، ز دل ستاں گیرد
چناں بکنجِ چمن یافت ذوقِ طاعتِ حق — کہ شیخ شہر چو ما ترکِ خان و ماں گیرد
حریصِ جلوہ، نگہ در ہجومِ لالہ و گل — چو آں گدائے کہ دنبالِ کارواں گیرد
چنیں کہ شاخ ہمی سبزہ بر زمیں مالد — چرا کسے ثمر از دستِ باغباں گیرد

کیفیتِ صبح

تشبیبِ قصیدۂ منقبتِ حضرتِ امیرؑ

صبحے کہ در ہوائے پرستاریِ وثن[۱] — جنبد کلیدِ بتکدہ در دستِ برہمن
در رُفت و روبِ دیر، دمِ گرم راہباں — آرد برون گداختہ، شمع از لگن
خیزند دستہ دستہ[۲] مُغاں نشستہ روے — در آرزوی چیدنِ بَرسَم[۳] ز ناردن
از شورِ دَیریاں بگمانِ خروشِ صُور — اموات را ز رقص بہ تن بردَرَد[۴] کفن
رخشندہ ستارہ از رُخِ نا شُستہ، صنم — بالد بنفشہ از قدِ خم گشتہ، شمن[۵]
بر رُوے خاک جلوہ کند سایہ در نظر — بر بُوے دوست حلقہ زند مرغ در چمن
خواہد چراغِ کشتہ چو شخصِ بُریدہ سر — خیزد گُلِ شگفتہ چو رنجورِ خستہ تن
بر جامِ مُل ز دیدۂ شبنم چکد نگاہ — بر رُوی گل ز طرۂ سنبل دَوَد شکن
غوغاے روز پردہ کشاید ز خوب و زشت — آواے کوس خواب رُباید ز مرد و زن

فخر و خود ستائی یا شکوۂ بخت و گردوں

اس مضمون کے کچھ متفرق اشعار ہم مرزا کے ایک ترکیب بند میں سے جو جنابِ امیرؑ کی منقبت

---

۱. بُت ۲. گروہ گروہ ۳. بَرسَم جھاؤ یا انار وغیرہ کی پتلی پتلی بالشت بھر کی شاخیں جن کو آتش پرست غسل یا طعام کے وقت ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ ۴. یعنی دریدہ شود ۵. شمن، بت

میں لکھا گیا ہے نقل کرتے ہیں۔ چوں کہ یہ نظم ایک خاص انداز کی منقبت اور خاص طرز کی شاعری پر مبنی ہے جس سے زمانۂ حال کے عام مذاق ناآشنا ہیں؛ مگر باوجود اس کے مرزا کے کلام میں شاعری کی حیثیت سے نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہے، اس لیے نہ اس کو اس موقع پر بالکل قلم انداز کیا جا سکتا ہے، اور نہ اوّل سے آخر تک نقل کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا متعدد بندوں میں سے جستہ جستہ اشعار متضمن مضمونِ مندرجۂ عنوان انتخاب کر کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں اور جہاں جہاں ضرورت ہوگی، مشکل مقامات کی شرح بھی کی جائے گی۔

بندِ اوّل

آں سحر خیزم کہ مہ را در شبستاں دیدہ ام　　شب نشیناں را دریں گردندہ ایواں دیدہ ام

اس تمام بند میں مرزا نے اپنی سحر خیزی اور جو کچھ اس نور ظہور کے وقت آسمان پر یا زمین پر نظر آیا ہے، اس کو بلیغ و جزیل اشعار میں بیان کیا ہے اور آخر کو اس سے ایک لطیف نتیجہ نکال کر شکایت آمیز فخر پر بند کو ختم کیا ہے۔ شعر مذکور کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ سحر خیز ہوں کہ میں نے چاند کو اس کی خواب گاہ میں دیکھا ہے اور شب بیداروں، یعنی کواکب یا ملائک کو اس گردندہ ایوان (یعنی آسمان) میں مشاہدہ کیا ہے۔

اینت خلوتخانۂ روحانیاں کز دور دور　　زہرہ را اندر ردائے نور عریاں دیدہ ام

اینت کلمۂ تحسین و تعجب ہے بمعنی زہے و خہے۔ روحانیاں فرشتے۔ آسمان کو کہتا ہے کہ کیا عمدہ خلوتخانہ روحانیوں کا ہے، جہاں میں نے دور سے یعنی زمین پر سے زہرہ کو چادرِ نور میں عریاں یعنی بغیر کسی حجاب کے دیکھا ہے۔

ہر یکے فارغ ز غیر و ہر یکے نازاں بخویش　　لولیے را دید دو عشرتکدہ مہماں دیدہ ام

ہرگز، اے ناداں! ابر سوائی نہ بندی دل کہ من　　ماہ را در ثور و کیواں را بمیزاں دیدہ ام

ان دونوں شعروں کا سمجھنا کسی قدر نجوم کی اصطلاحات جاننے پر موقوف ہے۔ منجموں نے دورِ فلک کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا ہے، جن میں سے ہر ایک حصّے کو بُرج کہتے ہیں اور ان کے نام یہ ہیں: حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دَلو، حوت۔ ان میں سے ہر ایک بُرج کسی نہ کسی سیارے کا خانہ کہلاتا ہے یا وبال۔ مثلاً جدی و دلو زحل کے خانے اور شمس و قمر کے وبال ہیں، اور برعکس اس کے اسد و سرطان شمس و قمر کے خانے اور زحل کے وبال ہیں۔ اسی طرح ہر بُرج ایک سیارے کا خانہ اور دوسرے کا وبال ہے۔ ثور اور میزان جن کا دوسرے شعر میں نام آیا ہے، یہ دونوں زہرہ کے خانے ہیں۔ اور ثور کے تین درجے چاند کے شرف اور میزان کے اکیس درجے زحل کے شرف کے مقام ہیں۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے چاند کو اس کے شرف کے مقام (یعنی ثور) میں دیکھا اور کیوان یعنی زحل کو اس کے شرف کے مقام (یعنی میزان) میں دیکھا، اور چوں کہ ثور اور میزان زہرہ کے خانے ہیں، اس لیے اس مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ میں نے ایک لُوٹی (رنڈی) یعنی زہرہ کی دو عشرت گاہوں یعنی ثور و میزان میں دو ایسے مہمان دیکھے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کے حال سے بے خبر اور ہر ایک اپنے حال میں خوش ہے کہ میرے سوا کوئی دوسرا زہرہ کی عشرتگاہ میں نہیں ہے۔ پھر دوسرے شعر میں دفع دخلِ مقدر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس بیان کو کسی بُرے معنی پر محمول نہ کرنا چاہیے، بلکہ صرف مطلب یہ ہے کہ میں نے ماہ کو ثور میں اور زحل کو میزان میں دیکھا ہے۔

رفتہ ام زاں پس لبسیرِ باغ و مرغاں با بباغ ‏ ‏ سر بر سم خواب زیرِ بال پنہاں دیدہ ام

بر سم خواب یعنی جیسا کہ پرندوں کے سونے کا دستور ہے۔ سر زیرِ بال پنہاں یعنی بازو تلے سر گھسائے ہوئے۔

کلکِ موجِ نکہتِ گل دم زگردش نا زدہ　　　نامۂ فیضِ سحر نِنوشتہ عنواں دیدہ ام

موجِ نکہتِ گل کو کلک یعنی قلم قرار دیا ہے اور فیضِ سحر کو نامہ یعنی خط ٹھیرایا ہے۔ کہتا ہے کہ ایسا سویرا تھا کہ پھولوں کی خوشبو کا قلم ابھی گردش میں نہیں آیا تھا کہ میں نے فیضِ سحر کا مکتوب جب کہ اُس کا سرنامہ نہیں لکھا گیا تھا، دیکھا۔ مطلب یہ کہ فیضِ سحر ابھی عام نہ ہوا تھا اور پھولوں کی خوشبو سے باغ مہکنے نہیں پایا تھا۔

شانۂ بادِ سحرگاہی بہ جنبش نامدہ　　　طرۂ سنبل بہ بالیں بر پریشاں دیدہ ام

اس بیت میں بادِ سحرگاہی کو کنگھی فرض کیا ہے جس کے ملائم جھونکوں سے گویا سنبل کی زلف سلجھ جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ابھی شانۂ نسیم صبح کو جنبش نہیں ہوئی تھی اور طرۂ سنبل بالینِ راحت پر پریشان پڑا ہوا تھا۔

بادِ سرمستانہ می جنبید و شبنم می چکید　　　غنچہ را در رختِ خواب آلودہ داماں دیدہ ام

یہ اس حالت کے بعد کا بیان ہے جو پہلے دو شعروں میں بیان ہوئی ہے۔ کہتا ہے کہ ہوا رساں رساں چل رہی تھی اور شبنم ٹپک رہی تھی جس کی وجہ سے میں نے غنچہ کو رختِ خواب میں آلودہ داماں دیکھا، یعنی اگرچہ غنچہ ابھی دوشیزگی کی حالت میں معلوم ہوتا تھا، مگر چوں کہ وہ عنقریب کھِلنے والا تھا اس لیے وہ گویا اپنے رختِ خواب میں آلودہ دامن ہو چکا تھا۔

صبحِ اوّل گو بروے کس نیاورد از حیا　　　صبحِ ثانی را بریں ہنگامہ خنداں دیدہ ام

اب ان تمام عجائبات کی جو آخرِ شب اُس کو نظر آئے ان کی قلعی کھولتا ہے اور کہتا ہے کہ صبحِ اوّل (یعنی صبحِ کاذب جو گویا شرم و حجاب سے ایک جھلکی دکھا کر غائب ہو جاتی ہے) اگرچہ وہ حیا سے اصل بھید منہ پر نہیں لاتی مگر صبحِ ثانی یعنی صبحِ صادق کو میں نے اس تمام ہنگامے پر خندہ زن دیکھا۔ مطلب یہ کہ یہ تمام نظر فریب سیمیائی جلوے تھے، جن کو محض وہم نے اختراع کیا تھا اور اسی لیے صبحِ صادق ان پر خندہ زن

تھی۔ اس کے بعد بند کو اس گرہ کے شعر پر ختم کرتا ہے اور کہتا ہے:

محرمِ رازِ نہانِ روزگارم کردہ اند   تا بجرم گوش تنہد خلق، خوارم کردہ اند

کہتا ہے کہ اگرچہ مجھ کو زمانے کے پوشیدہ اسرار کا محرم بنایا ہے، مگر اس لیے کہ کوئی میری بات نہ سنے اور پوشیدہ راز ظاہر نہ ہونے پائیں، مجھ کو دنیا میں ذلیل و خوار کر دیا ہے۔

از بندِ سوم

روشناسِ چرخ در جمع اسیرانش منم   نورِ چشمِ روزنِ دیوارِ زندانش منم

کہتا ہے کہ آسمان کے مظلوم اسیروں میں اس کا روشناس اور پہچاننے والا صرف میں ہوں۔ گویا میں اُس زندان کے روزنِ دیوار کی، جس میں آسمان کے مظلوم قیدی اسیر ہیں، آنکھ کا نور ہوں۔

ثابت و سیارِ گردوں را رَصَد بستم ز علم   رشتۂ تسبیحِ گوہر ہائے غلطانش منم

چوں کہ رَصَد باندھنے سے اکثر ستارے منتظم ہو جاتے ہیں، اس لیے کہتا ہے کہ میں نے جو آسمان کے ثوابت و سیارات کی رَصَد باندھی ہے، تو گویا میں اس کے گوہر ہائے غلطاں (یعنی کواکب) کی تسبیح کا ڈورا ہوں جس کے سبب سے تمام ستارے مثل دانہائے تسبیح کے منتظم ہو گئے ہیں۔

نے ز دانش کامیاب و نے بہ سختی تنگدل   شرمسارِ کوششِ برجیس و کیوانش منم

اہلِ نجوم کے نزدیک برجیس یعنی مشتری علم کا اضافہ کرنے والا ہے، اور کیواں یعنی زحل سختی اور مصیبت کا بھیجنے والا ہے۔ کہتا ہے کہ نہ میں علم سے کامیاب ہوں اور نہ سختی و مصیبت سے گھبرانے والا ہوں۔ تو گویا مشتری اور زحل دونوں کی کوششیں میرے باب میں رائگاں جاتی ہیں اور اس لیے میں ان دونوں سے شرمندہ ہوں۔

در لیئمی شہرۂ دہر از تہی دستیست چرخ　　رفتہ مسکیں راز یاد و گنج پنہانش منم

کہتا ہے کہ آسمان جو لیئمی اور بخل میں مشہور ہے، یہ اس کی تہی دستی کا نتیجہ ہے، کیوں کہ اس کے پاس دینے کو کچھ باقی نہیں، وجہ یہ کہ اس کا گنجینۂ پنہاں میں تھا سو وہ اپنے خزانے کو یعنی مجھ کو بھول گیا ہے۔ مسکین سے مراد خود آسمان ہے ا جیسے اُردو میں کہتے ہیں کہ غریب اپنا خزانہ کہیں رکھ کر بھول گیا۔

در غریبی خویش را از غصہ در دل می خلم　　خوردہ ام از شستِ غم تیرے کہ پیکانش منم

یعنی عالمِ غربت میں بسبب غم کے مَیں خود اپنے دل میں چبھتا ہوں۔ گویا غم کی چٹکی سے وہ تیر میرے آکر لگا ہے کہ خود میں ہی اُس تیر کی بھال ہوں۔

ماندہ ام تنہا بکنج از دورباشِ پاسِ وضع　　خانۂ دارم کہ پندارند درباشش منم

دورباش ہٹو بڑھو کی آواز کو کہتے ہیں جو نقیب، امراء و سلاطین کی سواری کے آگے آگے پکارتے جاتے ہیں۔ مگر شعراء اس کو اکثر مطلق روک ٹوک اور ممانعت و مزاحمت کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کہتا ہے کہ پاسِ وضع مجھ کو گھر کے کونے سے کہیں باہر نہیں جانے دیتا۔ پس میری اپنے گھر پر ایسی مثال ہے کہ گویا اس کا دربان میں ہی ہوں۔

پایۂ من جز بہ چشمِ من نیاید در نظر　　از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر

از بندِ چہارم

چوں بغیر از عمر کاں مفت است ہیچم مایہ نیست　　نبودم بیم زیاں گر چرخ کج بازد بمن

بر منش دستے تواند بود، زاں بالاترم　　دل بنازم شیرِ گردوں پنجہ گر یازد بمن

پہلے مصرع کی تقدیرِ عبارت یہ ہے: "من ازاں بالاترم کہ فلک را بر من دستے تواند بود"۔ شیرِ گردوں سے مراد خود گردوں یا برجِ اسد یا مریخ۔ پنجہ یازیدن، دست دراز کردن و حملہ نمودن۔ دل باختن، بدحواس شدن۔

ہر کرا گردوں بلند آوازہ تر خواہد بدہر نوبتِ شاہی دہد وانگاہ بنوازد بمن
بنوازد بمن ، یعنی اس کو میرے ذریعہ سے معزز کرتا ہے ۔ دوسرے شعر میں اس کی تشریح ہے ۔

پادشاہاں را سخن گفتن نہ کارِ ہر کس ست دیدہ ور شاہے کہ کارِ گفتن اندازد بمن
ور تو گوئی پادشہ را مایہ نبود، بیم نیست خود بہ شاہاں مایہ بخشم اگر بپردازد بمن
آں کہ چوں در ملکِ ہستی سکۂ شاہی زند سکۂ شاہی بطغرائے ید اللّٰہی زند

قولہ " پادشہ را مایہ نبود " اس سے یا تو یہ مراد ہے کہ سلاطینِ عہد اس قدر مایہ نہیں رکھتے کہ میرے کمال کے موافق میری قدر کریں، اور یا یہ مطلب ہے کہ بہادر شاہ مرحوم جو اُس زمانے میں مرزا کے ممدوح اور پادشاہ کے لقب سے ملقب تھے، وہ گردشِ روزگار سے بے مایہ ہیں ۔ قولہ " گر بپردازد بمن " بپردازد کا فاعل دوسری بیت میں واقع ہوا ہے یعنی " آنکہ چوں در ملکِ ہستی الخ " مراد اس سے حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰؓ ہیں جن کی منقبت میں مرزا نے یہ بند لکھا ہے ۔

قطعات

توجیہ توارد خود با کلامِ سلف

ہزار معنیِ سرجوش، خاص نطقِ من ست کز اہلِ ذوق دل و گوی از عمل بردست
ز رفتگان بہ یکے گر توارد م رُو داد مداں کہ خوبیِ آرایشِ غزل بردست
مرا ست ننگ، ولے فخر اوست کان بہ سخن بسعیِ فکرِ رسا، جا بداں محل بردست
مبر گمانِ توارد، یقین شناس کہ دزد
متاعِ من ، ز نہاں خانۂ ازل بردست

رندانہ

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار
ساقی و مغنی و شرابے و سرودے

زنہار، ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند
حق را بہ سجودے و نبی را بہ درودے

خطاب بہ یکے ز افغانِ تونگر

اے کہ خواہی کہ بعد ازیں باشم
مخلصِ صادق الولائے تو، من

گر ترا شیوہ شاہدی بودے
کردمے جان و دل فدائے تو، من

ور ترا پیشہ شاعری بودے
سودمے چشم و سر بہ پائے تو، من

ور ترا پایہ خسروی بودے
سفتمے گوہرِ ثنائے تو، من

چوں ازیں ہا ہیچ، مرا چہ ضرور
کہ شوم ہرزہ مبتلائے تو، من

راست گویم، بہانہ چند آرم
ناصحِ مشفقم، برائے تو، من

بسکہ بر مال و جاہ مغروری
نیستم خوش ازیں ادائے تو، من

چکنی؟ کایں فسادِ سیم و زرست
وائے من! اگر بوم بجائے تو، من

بتو ہرگز ندادمے زر و سیم
خواجہ! اگر بودمے خدائے تو، من

خطاب بہ یکے از نواصب

دیدی آں بدگہر و مہر و لائیش بہ یزید
کہ بہ خشم آید، اگر زشت و پلیدش گویند

زانکہ او خود بسرِ ابنِ علی تیغ نہ راند
خواجہ از ننگ نخواہد کہ یزیدش گویند

گفتم البتہ کہ شبیر بداں می ارزد
کہ شہیدش بنویسند و سعیدش گویند

گفت زاں رو کہ عزیزاں ہمہ مسلم بودند
نتواں کرد گوارا کہ شہیدش گویند

خطاب بہ یکے از مخالفانِ خود

کردۂ جہدے کہ در ویرانیِ کاشانہ ام
چرخ در آرایشِ ہنگامۂ عالم نہ کرد

گر بہ ہجوت راندہ باشم نکتہ ہا، بر خود مپیچ
زانکہ حرفے زانچہ گفتم، خاطرم خرم نہ کرد

بیتے از اُستاد دیدم ذوقکے بخشید لیک ہیچ در تسکیں نیفزود و ز وحشت کم نہ کرد
"ہمچو تو ناقابلے در صُلبِ آدم دیدہ بود زاں سبب ابلیسِ ملعوں سجدہ بر آدم نہ کرد"
حاش للہ بودنت در صُلبِ آدم تہمت ست پیشِ ہر کس گفتم ایں اندیشہ، باور ہم نہ کرد

شوخی

ایا، زیاں زدہ غالب کہ از حدیقۂ بخت نمیرسد ز تو خار و خسے ز ہیچ سبیل
چو لازم ست کہ پروردگار تا دم مرگ بود بہ رزقِ ضروریۂ عباد کفیل
چراست اینکہ نداری زر از سیاہ و سفید چراست اینکہ نیابی بر از کثیر و قلیل
فتادہ در سرِ ایں رشتہ عقدۂ، ورنہ نہ مردۂ تو وتے رازق العباد بخیل
ز چند سال برگِ تو و تباہیِ رزق شدست حکم، خود از پیشگاہِ ربِ جلیل
فرشتۂ کہ وکیل ست بر خزائنِ رزق نکرد ہیچ توقف بہ رزق در تعطیل[1]
دوم فرشتہ کہ یادش بخیر مقروں باد روا نداشت در اہلاک شیوۂ تعجیل
لطیفۂ کنم از قولِ شاعرے تضمین کہ در لطیفہ مرا اُو را کسے نبودہ عدیل
"اگر خدائے بداند کہ زندۂ تو ہنوز ہزار مشت زند بر دہانِ عزرائیل"

شوخی

بہ آدم زنے، بشیطاں طوقِ لعنت سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیریِ طوقِ آدم گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

اب ہم مرزا کی ایک نظم کا مقابلہ دورۂ اکبری کے ایک نہایت ممتاز اور نامور شاعر کے کلام کے ساتھ کرتے ہیں۔ مرزا کے قصائد و قطعات و مسمطات وغیرہ میں صرف ایک نظم ایسی ملی ہے جس کا مولانا نظیری نیشاپوری کی نظم سے

---

۱ یعنی در تعطیل برزق توقف نہ کرد ۲ یعنی ملک الموت

بخوبی مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ نظیری نے جلال الدین اکبر کے بیٹے سلطان مُراد کا جو عنفوانِ شباب میں گزر گیا تھا، ایک مرثیہ ترکیب بند میں لکھا ہے، جو اس کے کلیات میں موجود ہے اور چوں کہ نظیری کو اس کے ساتھ نہایت خصوصیت تھی اور اس کی شان میں نظیری نے متعدد قصیدے لکھے ہیں اور گراں بہا صلے ان کے جلدو میں پائے ہیں، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ نظیری نے اس کا مرثیہ کمال صدقِ دل سے لکھا ہے۔

مرزا نے بھی مرحوم بہادر شاہ کے بیٹے فرخندہ شاہ کا، جو عین نشو و نما کے زمانے میں فوت ہو گیا تھا، مرثیہ اُسی بحر کے ترکیب بند میں لکھا ہے، جو مرزا کے کلیات میں موجود ہے۔ چوں کہ دونوں ترکیب بند تیموری شہزادوں کے مرثیے میں لکھے گئے ہیں اور دونوں کا وزن متحد ہے اور ہر ایک میں سات سات بند اور ہر ایک بند آٹھ آٹھ بیت کا ہے، اس لیے ہم یہ دونوں نظمیں مقابل میں دیتے ہیں، تا کہ ہر شخص جو فارسی شاعری کا مذاقِ صحیح رکھتا ہے، دونوں میں بآسانی موازنہ کر سکے۔ مگر افسوس کہ کلیاتِ نظیری کا کوئی صحیح نسخہ ہم کو دستیاب نہیں ہوا۔ لہذا جیسا کچھ لکھا ہوا پایا، نقل کر دیا گیا ہے چنانچہ پہلے بند کے بعض شعر بالکل سمجھ میں نہیں آئے جن کی نسبت ظنِ غالب یہ ہے کہ ان میں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے۔

بند اوّل

غالب	نظیری
اے دل! بچشمِ زخمِ حوادث نگار شو	لب خوش نگشتہ، خندہ رہ چنگ میزند
اے چشم! از تراوشِ دل اشکبار شو	در بزمِ مرگ خندہ بر آہنگ میزند
اے خوں! بدیدہ دردِ گدازِ جگر فرست	ہرگز زمانہ، جامۂ ماتم بروں نہ کرد
اے دم! بسینہ دودِ چراغِ مزار شو	تا رفتہ شب، بدامنِ شب چنگ میزند
اے لب! بنوحہ نالۂ جانکاہ سازدہ	وقتِ گذشتہ را بہ تاسف زپے مرد

اے سر! بغصہ خاکِ سرِ رہگذار شو
اے خاک! چرخ گر نتواں زد، ز جا درآے
اے چرخ! خاک گر نتواں شد، غبار شو
اے نوبہار! چوں تنِ بسمل، بخوں بغلط
اے روزگار! چوں شبِ بے ماہ، تار شو
اے ماہتاب! روی بہ سیلی کبود کن
اے آفتاب! داغِ دلِ روزگار شو
اے فتنہ! بادِ صبح وزید، اینقدر مخسپ
اے رستخیز! وقت رسید، آشکار شو

کاینجا نشاط گام بفرسنگ میزنند
ایں دہر روز کور، کُش ایام خصم باد
دستِ طمع بہ گیسوے شبرنگ میزنند
دستِ اجل بہ تیغِ سیاست بریدہ باد
از خاک مُہر بر دہنِ تنگ میزنند
آرایشِ جنازہ و دستار میکنند
گویی کہ گل بر افسر و اورنگ میزنند
ایں چرخ شوخ دیدہ عجب بےبصارت ست
بر جامِ عشرتِ کہ، بہ بیں سنگ میزنند
آہ ایں چہ سیل بود کہ ما را ز سر گزشت
فرزندِ شاہِ اکبرِ والا نژاد مُرد
تنہا ز سر نگو کہ، ز دیوار و در گزشت
شیون برآورید کہ سلطان مراد مُرد

مرزا کے بند میں الفاظ بہت پُرشوکت و شاندار واقع ہوئے ہیں اور کوئی شعر صنعتِ شاعری اور شاعرانہ نزاکت سے خالی نہیں ہے، مگر واقع کی عظمت جس قدر کہ بیان ہونی چاہیے تھی، اس سے بمراتب زیادہ ظاہر کی گئی ہے، بخلاف نظیری کے کہ اس کا بیان اگرچہ رُوکھا پھیکا معلوم ہوتا ہے، مگر متانت و اعتدال کا سررشتہ اس نے کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

بند دوم

غالب

بگذر کہ بر من و تو جفا کرد روزگار
با پادشاہِ عہد چہا کرد روزگار

نظیری

آفاق پُر دریغ و جہاں پُر ندامت ست
ایں روزِ مرگ نیست کہ روزِ قیامت ست

شاہِ سخن سرائے سخنور نواز را
در بزمِ عیش نوحہ سرا کرد روزگار
شاخے کہ بود موسمِ آتش کہ برد بر
از نخلِ عمرِ شاہ جدا کرد روزگار
مرگ اینچنیں رُخ و تنِ نازک ندیدہ بود
کامِ اجل بہ ہدیہ روا کرد روزگار
شہزادہ خرد سال و بود روزگار پیر
شوخی بشاہزادہ چہا کرد روزگار
فرزندِ پادشہ نشناسد معانقہ[۲]
آغوشِ گور بہرِ چہ وا کرد روزگار
اے آں کساں کہ خاکِ رہِ شہریار را
توجیہ آبروئے شما کرد روزگار
ہر چند بے اجل نتواں ہیچ گاہ مُرد
آتش بخود زنید کہ فرخندہ شاہ مُرد

خلقے پُر اضطراب، چہ جائے تمکن ست
دہرے پُر انقلاب، چہ جائے اقامت ست
ایں ماتمِ کسے ست کہ از گریہ تا بہ حشر
بر جیبِ صبح و دامنِ شبہا علامت ست
خوں میکند بجلوہ دلِ خلق، گوئیا
نخلِ جنازہ رستہ ازاں نخلِ قامت ست
ہر کس چنیں جمال در آرد بحشر گاہ
رضواں گرش بہشت دہد در غرامت[۲] ست
دل از نویدِ صحتِ او بزمِ سور بود
اکنوں سرائے ماتم و کوئے ملامت ست
یاراں! عجب شکارے کہ از دست [illegible]
برسر زنید دست کہ وقتِ ندامت ست
شہبازِ ما پریدہ، رہِ آسماں گرفت
مرغے نرفتہ است کہ دیگر تواں گرفت

یہ دونوں بند سادگی اور مرثیت میں تقریباً برابر سرابر ہیں، البتہ نظیری کے بند کا چوتھا شعر جس رتبہ کا ہے ایسا کوئی شعر غالب کے بند میں نہیں ہے۔

بند سوم

غالب

اے قوم! خویش را بشکیب امتحاں کنید
ایں کار را بشیوۂ کارآگہاں کنید

نظیری

اے بزمِ نیرہ! سرخ چوں ارغواں کجاست
وے بزمِ درہمی! شہِ گیتی ستاں کجاست

---

۱ ابتدا ۲۔ خبر ۳۔ یہ اشارہ ہے اس دستور کی طرف کہ خاندانِ تیموریہ کے سلاطین اور شاہزادے کسی سے معانقہ نہیں کرتے تھے۔

طفل ست شاہزادہ و در رہ خراب ست
منعش ز عزمِ رہروی آں جناب کنید
از میوہ و گل آنچہ دلش خواہد آں دہید
از حیلہ آنچہ رائے شما باشد، آں کنید
ہر حرفِ دلنشیں کہ بگویید و نشنود
آں گفتہ را بعربدہ خاطر نشاں کنید
در خود ز رفتنش نتوانید باز داشت
بیخود شوید، جامہ درید و فغاں کنید
گیرید دشنہ در کف و ہم بر جگر زنید
تا سینہ را ز دیدہ فزوں خونچکاں کنید
زنہار پیشِ شاہ مگویید و بے خبر
تابوت را بجانبِ مرقد رواں کنید
اے اہلِ شہر! مدفنِ ایں دودماں کجاست؟
خاکم بفرق، خوابگہِ خسرواں کجاست؟

شوقِ سجود و حرمتِ تعظیم کمتر ست
آں نازِ صدر و سرکشیِ آستاں کجاست
امروز غم بہ مسندِ شاہی نشستہ است
پہلو نشینِ خسروِ ہندوستاں کجاست
آں حکمہا کہ بود ازو آبِ کار کو؟
واں کارہا کہ آمد ازو بوی جاں کجاست
دلہا پُر از غم ست، عزیزاں! چہ واقع ست
یک دل شگفتہ نیست، خوشی در جہاں کجاست
ہر جا بسوگِ مرگ گروہے نشستہ اند
زیں غم کہ عام گشت، ندانم، اماں کجاست
برگ و شگوفہ ریخت، ثمر از کجا خورم
بشکست شاخ و برگ، مرا آشیاں کجاست!
کس را سرود در خورِ ایں تعزیت نبود
پیدا کنید کاولِ ایں داستاں کجاست
خلقے بشیون اند و نگویند حال چیست
صبرِ سخن شنیدن و تابِ بیاں کجاست
آفاق در مصیبتِ او ممتحن شدہ
ایں مرگ باعثِ المِ مرد و زن شدہ

اس بند میں نظیری نے برخلاف پہلے بندوں کے دو شعر زیادہ کر دیے ہیں۔ نظیری کا بند بلاغت میں شاید مرزا کے بند سے کسی قدر فائق ہو، مگر مرزا کے بین نہایت دلخراش ہیں۔ متوفی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکا

ہے اور راہ میں بہت خطرے ہیں، اس کو جانے سے روکو اور وہ جو کچھ مانگے اس کو دو اور جو بہانہ مناسب سمجھو، وہ کرو اور اگر سیدھی طرح کہنا نہ مانے، تو اس کو سختی سے سمجھاؤ اور اگر یوں بھی کام نہ نکلے، تو روؤ اور پیٹو اور کپڑے پھاڑو اور چناں کرو اور چنیں کرو اور بادشاہ کو اطلاع کیے بغیر تابوت مرقد میں لے جاؤ، یہ تمام پیرایے بیان کے نہایت موثر اور دلخراش ہیں، اور گرہ کا شعر سارے بند کا نچوڑ ہے۔

بندِ چہارم

نظیری	غالب
غم خاست، در پیالہ مے از ساغر افگنید	زاں سبز خط کہ بر رخِ او نادمیدہ ماند
شد بزم تیرہ، پردہ ازاں رخ بر افگنید	گردے بدل نشست و غبارے بدیدہ ماند
شمعے کہ دہر روشن ازو بود، مردہ است	بستانیاں بماتمِ شہزادہ بیخود اند
پروانہ را بریدہ بہ خاکستر افگنید	زیں رو بود کہ پیرہن گل دریدہ ماند
در خانہ اش ز حلقہ، ماتم حرام نیست	خوں گشت مور دل و جگرِ دوستاں فتاد
ایں حلقہ را ز صحنِ سرا بر در افگنید	آں بادہ ہائے ناب کزو ناکشیدہ ماند
ریحانِ جلوہ یاسمنِ عشوہ ریختہ	در مدحِ شاہزادہ سخن ہائے دلپذیر
چنید و ہم بر آں خدِ جاں پرور افگنید	دردا کہ ہم نگفتہ و ہم ناشنیدہ ماند
بالیں زتابِ کاکلش آشفتگی کشید	در وادیِ عدم نہ تواں رفت با حشم
کوتہ کنید عربدہ در کشور افگنید	ماند آنچہ بود و صاحبِ عالم جریدہ ماند
رفت آں سرے کہ تاج بأو سرفراز بود	زاں گلبنے کہ صرصرِ مرگش ز پا فگند
بر سر کنید خاک و کلاہ از سر افگنید	خارے بیادگار بدلہا خلیدہ ماند
پوشیدہ چند جامۂ نیلی ز جورِ چرخ	اخلاقِ شاہزادہ بود دلنشینِ خلق
بر آفتاب جامۂ نیلوفر افگنید	بوے ازاں شگفتہ گلِ نورسیدہ ماند

آں سروِ سایہ دار کہ بارش نبود، کو؟ — خیزید، تاباں سرِ تابوت دم زنیم
واں نو گلِ شگفتہ کہ خارش نبود، کو؟ — عرضِ کلیم وکارِ داعش بہم زنیم

اس بند میں مرزا کا بیان صفائی اور سادگی اور لطافت میں نظیری کے بیان سے سبقت لے گیا ہے، جیسا کہ اصحابِ ذوق پر پوشیدہ نہیں ہے۔

بند پنجم

غالب

دستے ست اے سپہر! ترا در ستمگری
بارے بَرَم ز جورِ تو پیشِ کہ داوری
نیرنگ سازِ چرخ کہ بیداد خوے اوست
با گل کند سمومی و با شاخ صرصری
داغم ز روزگار کہ شہزادہ برنخورد
از خوبی و جوانی و فرخندہ گوہری
حیف ست مردنش کہ در ایامِ کودکی
بود اوستادِ قاعدۂ بندہ پروری
شہ دردہ و دو سالگیش کردہ کدخدا
با فرِّ خسروانی و فرتابِ قیصری
ناگاہ روزنامۂ عمرش دریدہ شد
امضا پذیر ناشدہ توقیعِ شوہری

نظیری

رفتی و کارہا ہمہ در ہم گذاشتی
آشفتگی بہ مردمِ عالم گذاشتی
جانہاے غم رسیدہ و دلہاے بیقرار
در پیچ و تابِ طرّۂ پرخم گذاشتی
از تو غبار بر دلِ بیگانہ نہ بود
بہر چہ بر دلِ پدر ایں غم گذاشتی
روز و شبت بہ رسمِ جنیبت سادہ بود
در زینِ خویش اشہب و ادہم گذاشتی
شمع مزار و خشتِ لحد ساختی قبول
رخسارِ تخت و طرّۂ پرچم[1] گذاشتی
ہمت ترا بہ ملک نیاورد سر فرو
عالم بہر کہ خواست[2] مسلّم گذاشتی

---

۱ عَلَم

۲ یعنی بجہانگیر

جز نو عروسِ صاحبِ عالم نیافتند
دوشیزۂ کہ بیوہ کنندش بہ دختری
زیبائی و جوانیِ فرخندہ شاہ، حیف!
آں نونہال سرو قدِ کجکلاہ، حیف!

حرمت نگاہداشتی و جاے خویش را
بہرِ برادرانِ مقدم، گذاشتی
خون ست دل بے تو گر ہمہ دل ہچو دلِ من ست
ہر دل کہ بے تو خوں نشود، سنگ و آہن ست

اگرچہ یہ دونوں بند اپنی اپنی جگہ نہایت بلیغ ہیں، مگر متانت و جزالت کے لحاظ سے نظیری کا پلّہ غالب معلوم ہوتا ہے۔

بندِ ششم

غالب

اے رہ نوردِ عالمِ بالا! چگونہ؛
ما بے تو در ہمیم، تو بے ما چگونہ؛
از سایہ در غمِ تو سیہ پوش شد ہما
اے خفتہ در نشیمنِ عنقا! چگونہ؛
زاں پس کہ با تو آب و ہواے جہاں نساخت
در روضۂ جناں بہ تماشا چگونہ؛
با گلرخانِ دہر وفائے نداشتی
با حوریانِ آینہ سیما، چگونہ؛
ما بے خوداں بحلقۂ ماتم نشستہ ایم
از خویشتن بگوے کہ تنہا چگونہ؛
بے مطرب و ندیم و غلامانِ خرد سال
بے باغ و قلعہ و لبِ دریا چگونہ؛
بعد از تو شاہ خیلِ ترا برقرار داشت

نظیری

اے شاہِ مصر! دور ز کنعاں چگونہ؛
اے یوسف! از جدائیِ اخواں چگونہ؛
ہر گاہ جلوہ کردہ، تقاضا چہ می کنی
با حسنِ شوخ در تہِ زنداں چگونہ؛
اسکندر از غمِ تو بظلمت نشستہ است
در زیرِ گل تو چشمۂ حیواں چگونہ؛
اے پارۂ ز جان و جگر گوشۂ پدر!
گشتہ جدا ز دیدہ و داماں چگونہ؛
ما بارے از فراقِ تو در خون دیدہ ایم
تو درمیانِ روضۂ رضواں چگونہ؛
آوازِ نوحہ طبع و دل آشفتہ می کند
اے بختِ خوش بخوابِ پریشاں چگونہ؛
اینجانت کارِ دفترِ دیواں حوالہ بود

اینجا عزیز بودهٔ، آنجا چگونهٔ
اے بعدِ مرگ راتبہ خوارِ تو عالمے
پروانہ، چراغِ مزارِ تو عالمے

آنجا بگو ز پرسشِ دیواں چگونهٔ
قلزم سبک ثبات تر آنجا ز شبنم ست
در بحرِ گل تو قطرهٔ باراں چگونهٔ
بشنو کہ بانگ بہرِ تو بر حشر می زنند
تا بنگریم در صفِ دوراں چگونهٔ
چوں کارِ رفتگانِ دگر نیست کارِ تو
محشر شتاب میکند از انتظارِ تو

اس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں۔ نظیری کا یہ بند اس کے تمام ترکیب بند کی جان ہے۔ اگرچہ مرزا کے ہاں اس بند میں نظیری کے برابر بلند شعر نہیں ہیں، مگر مرثیت کا رنگ نظیری سے بڑھ کر پایا جاتا ہے۔

بندِ ہفتم

غالب

گفتار را بنوحہ گری چیدہ ام اساس
در نوحہ، شاعری مکنید از من التماس
در پردہ سنجی از دمِ خویشم رسد گزند
در رہروی ز سایۂ خویشم بود ہراس
من میہمان و چرخِ سیہ کاسہ میزبان
دُردی خورِ بلا کم و تلخابہ نوشِ یاس

نظیری

فردا کلاہِ بادشہی بر سرِ تو باد
رسم العمل بروزِ جزا دفترِ تو باد
فردا کہ روزِ حشر برانگیزی از زمیں
دوش و کنارِ حور و پریِ محشرِ تو باد
روزے کہ کارہا ہمہ موقوفِ حق شود
جبریل کارساز و خدا یاورِ تو باد

ــہ خاندانِ تیموریہ میں دستور تھا کہ خاص بادشاہ کی اولاد میں سے جب کوئی شہزادہ مرجاتا تھا تو اس کی تنخواہ اور نوکر چاکر اور اس کی سرکار بدستور بنی رہتی تھی۔

باقی نمانده اشک، چه گریم به های های
از کار رفته دست، چه بر تن درم لباس
سر حلقهٔ پلاس نشینانِ ماتمم
اندوهِ همدمانِ شه از خود کنم قیاس
چوں بود بزمِ ماتمِ شهزاده بے خروش
من دم زدم ز تلخ نوائی بریں پلاس
از نوحه عرضِ لطفِ سخن میتواں گرفت
غالب سخن سرای و شهنشه سخن شناس
یارب! جهاں ز فیضِ تو با برگ و ساز باد
عمرِ ابوظفر شهِ غازی دراز باد

وقتِ سوال گوش و لبِ منکر و نکیر
پُر از قبولِ نکتهٔ جاں پرورِ تو باد
آں حلّه کہ آدم ازو ذلّ و قدر یافت
گر رحمتِ دو کون بود، در برِ تو باد
مجموعهٔ عمل چو بہ محشر در آوری
کارِ تو راست همچو خطِ مسطرِ تو باد
مغز از بخورِ روے مزارت معطّرست
بوے بهشت هم نفسِ مجمرِ تو باد
آدم بجاے تو نشناسد دریں جهاں
تسبیحِ قدس در دلِ کانِ گوهرِ تو باد
نخلِ ریاضِ ملک کہ بابِ عزیزِ تست[٥]
سر سبز از دعاے ثنا گسترِ تو باد
کارش بہ حُسنِ شاهدِ فرخندگی بود
هر چند بر تو مرگ، بر و زندگی بود

اس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت کتاب کے چھپنے کی جلدی میں ہم کو اس قدر مہلت نہیں ملی کہ کلیاتِ نظیری کے صحیح نسخے کے ملنے کا انتظار کیا جاتا اور بعد کامل اطمینان کے اس ترکیب بند میں جو اشعار حل طلب تھے اُن کی شرح کی جاتی جس سے ناظرین کو ترکیب بندوں میں موازنہ کرنے کا زیادہ موقع ملتا۔ لیکن ہمارا

---

٥ پدرِ عزیزِ تست

ارادہ ہے کہ اس کتاب کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی، تو بشرطِ زندگی اس نقصان کی تلافی کی جائے گی۔

اب ہم کو مرزا کی کلیاتِ نظم فارسی میں سے صرف مثنوی کا نمونہ دکھانا باقی رہ گیا ہے۔ اگرچہ پہلے حصے میں کہیں کہیں مختلف مثنویوں کے کچھ کچھ اشعار مقتضائے مقام کے موافق نقل ہو چکے ہیں، مگر نمونے کے طور پر یہاں بھی ایک دو مقام کسی مثنوی کا دکھانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مرزا نے کوئی مبسوط مثنوی نہیں لکھی۔ ان کے کلیات میں گیارہ مثنویاں ہیں، جن میں سب سے بڑی مثنوی ۹۲۸ بیت کی ہے۔ اس مثنوی میں جس کا نام مرزا نے ابرِ گہربار رکھا تھا، ان کا ارادہ آں حضرت صلعم کے غزوات بیان کرنے کا تھا، مگر چوں کہ یہ ان کی آخری تصنیف تھی اور اخیر عمر میں طرح طرح کے عوائق اور موانع پیش آئے، اس وجہ سے غزوات کے شروع کرنے کی نوبت نہیں پہنچی۔ صرف دیباچے کے چند عنوان لکھنے پائے تھے کہ مکروہاتِ روزگار نے گھیر لیا۔ مگر یہ مثنوی اُن کی تمام مثنویوں میں ممتاز ہے اور ہم اسی مثنوی کے کچھ اشعار توحید میں سے اور کچھ اشعار مناجات میں سے، جو نہایت آزادانہ اور رندانہ طور پر لکھی ہے، اور کچھ نعت میں سے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

از توحید

سپاسے کزو نامہ نامی شود	سخن در گزارش گرامی شود
سپاسے کہ شوریدگانِ الست	دہندش بہ بانگِ قلم دل ز دست
سپاسے بہ پوزش در آمیختہ	ز دل جستہ و با دل آویختہ
سپاسے دِ دلی سوزِ کثرت ربائے	سپاسے دل افروزِ بینش فزائے

خدارا سزد کز در دل پروری | بدیں شیوہ بخشد شناساوری
خدائے کزاں گونہ روزی دہد | کہ ہم روزی و ہم دوروزی دہد

* * * *

رضاجوے ہر دل کہ درویش ہست | ہواخواہ ہر دل کہ گردیش ہست
نرنجد زانبوہِ خواہندگان | نباید ستوہ از پناہندگان
خرد جنسِ ہستی فروشندگان | دہد مزدِ بیہودہ کوشندگان
رُباید دل، امّا ز دل دادگان | کشد نار، لیکن ز افتادگان
ز بادے کہ بر دل وَزَد در نہفت | زباں را بہ پیدا در آرد بگفت
نگہ را کہ بیروں نہ باشد ز چشم | دہد بالِ پیدائیِ مہر و خشم
دل و دست باہمد گر دوختہ | دریں کیسہ کردار اندوختہ

یعنی در کیسہ کہ از بہم دوختنِ دل و دست بہم رسیدہ، کردارِ مردم اندوختہ است۔

رواں و خرد باہم آمیختہ | ازیں پردہ گفتار انگیختہ
نہ زیں شوکہا شمردن تواں | نہ راہ اندریں پردہ بردن تواں
بہ نیروے نہ چرخ برہم زدن | نشاید ز دانستنِ او دم زدن

یعنی بقوتے کہ ازاں نہ چرخ را برہم میتواں زد، از معرفتِ الٰہی دم نہ می تواں زد۔

گروہے بہ بندِ گہر یافتن | فرو بستہ دل در زمیں کافتن
یکے را دم تیشہ بر کان نخورد | یکے رہ بہ نایاب گوہر نہ بُرد
خرد کز جہانے ست پیشش خبر | نباشد ز عنوانِ خویشش خبر
نہ بیند جز ایں، ہیچ بینندۂ | کہ ما را بود آفرینندۂ
نگارندۂ پیکرِ آب و گل | شمارندۂ گوہرِ جان و دل
بگردش در آرندۂ نہ سپہر | بہ گردوں برآرندۂ ماہ و مہر

روان را بدانست سرمایہ ساز
زبان را بگفتار پیرایہ ساز

بہ شاہی نشانندۂ خسروان
زرہ‌زن ربانندۂ رہروان

بدانش بہ اندیشہ فرزانگان
بہ مستی نگہدارِ دیوانگان

جگر را ز خونابہ آشام دہ
نفس را بہ بیتابی آرام دہ

شناسندگان را بخود رہنماے
ہراسندگان را غم از دل رباے

نفسہا بہ سوداے او نالہ خیز
جگرہا بہ صحراے او ریز ریز

رگِ ابر را اشک باری از وست
دمِ برق را بیقراری از وست

زبانہاے خاموش گویاے او
نہان ہاے اندیشہ پیداے او

خرد را کہ جوید شناسائیش
نگہ خیرہ در برقِ پیدائیش

ددیٔ بے کفن مردۂ در رہش
خودی دادگر شحنۂ درگہش

٭ ٭ ٭

زہے ہستیِ محض و عینِ وجود
کہ نازد بہ یکتائیش ہست و بود

زشاخے کہ از قلزمے سر دہد
بہر تشنہ آشامِ دیگر دہد

بیک بادہ بخشد ز پیمانہ‌ئے
بہر ذرہ رقصے جداگانہ‌ئے

جہانِ ز طوفان بغرقاب در
ہنوزش ہمان چین بگرداب در

گرد ہے زمستی بہ غوغا درون
ہنوزش ہمان مے بہ مینا درون

اسیرش ز بندے کہ بر پاے اوست
شناسد کہ بر تختِ چیں جاے اوست

شہیدش بخویش از طرب بہرہ مند
بجز چشمِ زخمش نباشد گزند

٭ ٭ ٭

بہر لب کہ جوئی، نواے از وست
بہر سر کہ بینی ہواے از وست

اگر دیوسار[1] است بیہوش و دنگ
کہ ہموارہ پیکر تراشد ز سنگ

---

[1] دیوسار یعنی گمراہ

بہ بت سجدہ زاں رو روا داشتند / کہ بت را خداوند پنداشتند

دگر خیرہ چشمے ست نیر پرست / بہ دردِ مے از جامِ اندیشہ مست

بمہرش ازاں راہ جنبیدہ مہر / کزیں روزنش دوست بنمودہ چہر

زناری درونانِ اہریمنی / گروہے بود کز خرد دشمنی

زبس دادِ ناآشنائی دہند / بہ آتش نشانِ خدائی دہند

بہ تن ہا بر آذر گرایش کناں / بدلہا خدارا نیایش کناں

گروہے سراسیمہ در دشت و کوے / خداوند جوے و خداوند گوے

ز رسمے کہ خود را براں بستہ اند / بیزداں پرستی میاں بستہ اند

زمہرے کہ بیخواست در دل بود / پرستندِ حق گر بہ باطل بود

نظرگاہِ جمعے پریشاں یکے ست / پرستندہ انبوہ و یزداں یکے ست

کدامی کشش کاں ازاں سو کمیست / بدو نیک راجز بوے روے نیست

جہاں چیست؟ آئینۂ آگہی / فضاے نظرگاہِ وجہ اللّٰہی

بہر سو کہ رو آوری سوے اوست / خوداں رو کہ آوردۂ روے اوست

از مناجات

بروزے کہ مردم شوند انجمن / شود تازہ پیوندِ جانہا بہ تن

رواں را بہ نیکی نوازندگان / بہ سرمایۂ خویش نازندگاں

گہرہاے شہوار پیش آورند / فروبیدہ کردار پیش آورند

ز نورِ یکہ ریزند و خرمن کنند / جہاں را بخود چشم روشن کنند

بہ ہنگامہ با ایں جگر گوشگاں[3] / در آیند مشتے جگر توشگاں[4]

---

١ یعنی بخورشید ٢ پسندیدہ ٣ یعنی عزیزاں ٤ یعنی گروہے از جگرخوارگاں

ز حسرت بدل بردہ دنداں فرو — ز خجلت سر اندر گریباں فرو

دراں حلقہ من باشم و سینہ‌ — ز غم ہاے ایام گنجینہ‌

درآب و در آتش لب بر بردہ‌ — ز دشواری زیستن مردہ‌

تن از سایۂ خود بہ بیم اندروں — دل از غم بہ پہلو دو نیم اندروں

ز ناسازی و ناتوانی بہم — دم اندر کشاکش ز پیوندِ دم

ز بس تیرگیہاے روزِ سیاہ — نگہ خوردہ آسیبِ دوش از نگاہ

ببخشاے برناکسی ہاے من — تہیدست و درماندہ ام، واے من!

بدوشِ ترازو[1] منہ بارِ من — نسنجید بگزار کردارِ من

بکردار سنجی میفزاے رنج — گراں باریِ دردِ عمرم بسنج

کہ من با خود از ہر چہ سنجد خیال — ندارم بغیر از نشانِ جلال[2]

اگر دیگراں را بود گفت و کرد — مرا بارۂ عمر رنج ست و درد

چہ پرسی، چو آں رنج و درد از تو بود — غمے تازہ در ہر نورد از تو بود

فرو ہل کہ حسرت خمیرِ من ست — دمِ سردِ من، زمہریرِ من ست

مبادا بہ گیتی چو من ہیچ کس — جحیمی دل، زمہریری نفس

بپرسش مرا درہم افسردہ گیر — پرِ کاہ را صرصرے بردہ گیر

پس آنگہ بدوزخ فرستادہ دال — در آتش خس از باد افتادہ دال

پرسش سے مراد باز پرسِ قیامت ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے باز پرس سے مستثنیٰ رکھ اور یہ سمجھ لے کہ مجھ سے باز پرس ہو چکی اور ایک پرِ کاہ کو بادِ صرصر اڑا لے گئی اور یہ فرض کرے کہ میں دوزخ میں بھیجا جا چکا اور ہوا سے ایک تنکا

---

[1] میزانِ اعمال — [2] قہر

دہکتی آگ میں گر چکا۔

وگر ہمچنین ست فرجام کار | کہ می باید از کردہ راندن شمار

یعنی اگر انجامِ کار یہی ہے کہ اعمال کی باز پُرس ہونی ضرور ہے، تو

مرا نیز یارا ے گفتار دِہ | چو گویم بران گفتہ زنہار دِہ
دریں خستگی پوزش از من مجوی | بود بندۂ خستہ، گستاخ گوی

یعنی اس خستگی اور مصیبت کی حالت میں جو کچھ میری زبان سے نکل جائے، اس پر مجھ سے عذر مت چاہنا کیوں کہ خستہ و مصیبت زدہ غلام گستاخ گو اور بے باک ہوتا ہے۔

دل از غصہ خوں شد، نہفتن چہ سُود | چو ناگفتہ دانی، بہ گفتن چہ سُود
زباں گرچہ من دارم، اما ز تست | بہ تست ارچہ گفتارم، اما ز تست
ہمانا تو دانی کہ کافر نیم | پرستارِ خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را بہ اہرمنی | نبردم ز کس مایہ در رہزنی
مگر مے کہ آتش بگورم از دست | بہنگامہ پروازِ مورم از دست

یعنی صرف مجھ میں ایک عیب ہے کہ میں شراب پیتا ہوں اور اسی سے میری زندگی ہے، اس مطلب کو اس طرح ادا کرنا کہ "آتش بگورم از دست" اور "پروازِ مورم از دست" منتہائے بلاغت ہے۔ نشۂ شراب سے جو عارضی نشاط اور امنگ پیدا ہو جاتی ہے، اُس کو پروازِ مور سے بہتر کسی استعارے میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ جس طرح چیونٹی کی پرواز اس کی موت کی علامت ہے، اسی طرح نشۂ شراب کا عارضی نشاط آخر کار موجبِ ہلاکت ہوتا ہے۔

من اندوہگین و مے اندہ ربائے | چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے!

چناہ

حسابِ مے و رامش[1] و رنگ و بوے | ز جمشید و بہرام و پرویز جوے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند | دلِ دشمن و چشمِ بد سوختند
نہ از من کہ از تابِ من گاہ گاہ | بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستاں سرائے، نہ میخانہ | نہ دستاں سرائے[2]، نہ جانانہ
نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط | نہ غوغاے رامش گراں[3] بر بساط
بسا روزگاراں بہ دلدادگی | بسا نوبہاراں بہ بے بادگی
بسا روزِ باران و شبہاے ماہ | کہ بودہ است بے مے بچشمم سیاہ
افق را پُر از ابرِ بہمن مہی | سفالینہ جامِ من از مے تہی
بہاران و من در غمِ برگ و ساز | درِ خانہ از بے نوائی فراز[4]
جہان از گل و لالہ پُر بوی و رنگ | من و حجرہ و دامنی زیرِ سنگ
دمِ عیش جز رقصِ بسمل نبود | بہ اندازۂ خواہشِ دل نبود
اگر تافتم رشتہ، گوہر شکست | وگر یافتم بادہ، ساغر شکست
چہ خواہی ز دلقِ مے آلودِ من | ببیں جیبِ خمیازہ فرسودِ من
بناسازگاری ز ہمسائگاں | بہ سرمایہ جوئی ز بے مائگاں
سر از منتِ ناکساں زیرِ خاک | لب از خاکبوسِ خساں چاک چاک
بہ گیتی درم بینوا داشتی | دلم را اسیرِ ہوا داشتی
نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد | بہر بار زر پیل بارم دہد
کہ چوں پیل زانجا برانگیزمے | زرش بر گدایاں فرو ریزمے
نہ نازک نگارے کہ نازش کشم | بہر بوسہ زلفِ درازش کشم

---

۱ نغمہ　۲ مطرب　۳ مطرباں　۴ بند

بدیں عمرِ ناخوش کہ من داشتم
زجاں خار در پیرہن داشتم

چو دل زیں ہوسہا بجوش آیدے
زدل بانگِ خونم بگوش آیدے

ہنوزم ہماں دل بجوش اندرست
زدل بانگِ خونم بگوش اندرست

چو آں نامرادی بہ یاد آیدم
بہ فردوس ہم دل نیاسایدم

دلے را کہ کمتر شکیبد بہ باغ
در آتش چہ سوزی بسوزندہ داغ

صبوحی خورم گر شرابِ طہور
کجا زہرۂ صبح و جامِ بلور

درم شب رو بہائے مستانہ کو
بہنگامہ غوغائے مستانہ کو

دراں پاک میخانۂ بے خروش
چہ گنجائیِ شورشِ نائے و نوش

سیہ مستیِ ابر و باراں کجا
خزاں چوں نباشد بہاراں کجا!

اگر حور در دل خیالش کہ چہ
غمِ ہجر ذوقِ وصالش کہ چہ

چہ منت نہد ناشناسا نگار
چہ لذت دہد وصلِ بے انتظار

گریزد دمِ بوسہ، اینش کجا
فریبد بہ سوگند، دینش کجا

بَرَد حکم و نبود لبش تلخ گوے
دہد کام و نبود دلش کامجوے

نظربازی و ذوقِ دیدار کو
بہ فردوس روزن بدیوار کو

نہ چشم آرزومندِ دلالۂ
نہ دل تشنۂ ماہ پرکالۂ

ازینہا کہ پیوستہ میخواست دل
ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل

چو پرسش رگے رابکاود ز دل
دو صد دجلہ خونم تراود ز دل

بہر جرم کز روے دفتر رسد
ز من حسرتے در برابر رسد

بفرمائے کایں داوری چوں بود
کہ از جرم من حسرت افزوں بود

ہر آئینہ ہمچوں منے را بہ بند
تلافی فراخور بود نے گزند

بدیں مویہ در روزِ امید و بیم
بگریم بدانساں کہ عرشِ عظیم

شود از تو سیلاب را چاره جوی — تو بخشی بدان گریه ام آبروی

دگر خونِ حسرت هدر کردهٔ — ز پاداشِ قطعِ نظر کردهٔ

گزشتم ز حسرت، امیدیم هست — سپید آبِ روی سپیدیم هست

که البته این رندِ ناپارسا — کج اندیشه گبرِ مسلمان نما

پرستارِ فرخنده منشورِ[1] تست — هوادارِ فرزانه دستورِ[2] تست

به بندِ امید استواری فرست — به غالب خطِ رستگاری فرست

از نعتِ سید المرسلین

محمد کز آئینهٔ روی دوست — جز اینش ندانست دانا که اوست

رہے روشن آئینهٔ ایزدی! — که در روی گنجیده زنگِ خودی

ز رازِ نہاں پردہ بر زدہ — ز ذاتِ خدا معجزے سر زدہ

تمنائے دیرینهٔ کردگار — بوئے ایزد از خویش امیدوار

تن از نور پالودہ سر چشمهٔ — دلے ہمچو مہتاب در چشمهٔ

بہر جام ازو تشنہ جرعہ خواہ — بہر گام ازو معجزے سر براہ

کلامش بدل، ور فرود آمدن — ز دم جستہ پیشی بہ زود آمدن

خرامش بہ سنگ از قدم نقش بند — بہ رنگے کہ نادیدہ پایش گزند

بہ دستش کشادِ قلم نارسا — بہ کلکش سوادِ رقم نارسا[3]

دل امید جائی زیاں دیدگاں — نظر قبلہ گاہِ[4] جہاں دیدگاں

برفتار صحرا گلستاں کنے — بگفتار کافر مسلماں کنے

---

۱ یعنی قرآن ۲ نبی ۳ کنایہ از امّی بودنِ آنجناب ۴ امیدگاہ

بدنیا زدیں روشنائی دہے | بعقبیٰ ز آتش رہائی دہے
بخوے خوش، اندوہ کاہِ ہمہ | بآمرزش امید گاہِ ہمہ
زبس محرمِ پردۂ راز بُود | بنزدیکیِ حق سرافراز بُود
زرازے کہ یابد سرودے سروش | صدائیش بُودے زاوّل بگوش
خہے قبلۂ آدمی زادگاں! | نظرگاہِ پیشیں فرستادگاں!
کسائی دہِ نسلِ آدم بخویش | روائی دہِ نقدِ عالم بخویش
بلندی دہِ کعبہ بالاے اُو | گرامی کنے سجدہ سیماے اُو
یمن روشن از پرتوِ روے اُو | ختن بستۂ چینِ گیسوے اُو
زبت بندگی، مردم آزاد کن | جہانے بیک خانہ آباد کن
بمحرابِ مسجد رُخ آرائے دیر | بہ اندیشِ خویشش و دعاگوے خیر
توگویی ازبس دل زدشمن رباست | کہ سنگِ درش سنگِ آہن رباست

نثرِ فارسی

مرزا کی فارسی نثر کو جو مقدار میں فارسی نظم سے بہت زیادہ ہے، اس بنا پر کہ وہ وزن سے معرّا ہے، صرف ایشیائی اصطلاح کے موافق نثر کہا جاسکتا ہے، ورنہ اگر وزن سے قطع نظر کی جائے، تو مرزا کی نثر میں شاعری کا عنصر نظم سے بھی غالب تر معلوم ہوتا ہے، خصوصاً کلیاتِ نظم کا دیباچہ اور خاتمہ،

ہ یعنی خوشاوند

مہرِ نیمروز کے ابتدائی عنوان، تمام تقریظیں اور دیباچے جو لوگوں کی کتابوں پر مرزا نے لکھے ہیں اور مکاتبات کا ایک معتد بہ حصہ سراسر شاعرانہ خیالات اور پوئیٹکل نظم و نسق پر مبنی ہے۔

متاخرین میں ابوالفضل، ظہوری، طاہر وحید اور جلالائے طباطبا بڑے نثار مانے جاتے ہیں۔ مرزا بیدل کی نثر اگرچہ ان کی نظم کی طرح ایک دوسرا عالم رنگینی ہے، مگر وہ بھی اپنی شان اور اپنی آن بان میں بے نظیر ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے (اور ضرور تسلیم کرنی چاہیے) کہ مرزا نے متاخرین کی طرز انشا پردازی سے استفادہ کیا ہے، تو بھی متاخرین کی نثروں میں مرزا کی طرز کا سراغ لگانا ایسا ہی ہے جیسا تخمی آم میں پیوندی آم کا مزا ڈھونڈنا۔ تقریباً ساٹھ برس گزرے کہ لکھنؤ کے ایک نہایت لائق آدمی نے مرزا کی نثر کی نسبت یہ بات کہی تھی کہ شیخ ابوالفضل اور مرزا بیدل دونوں کے مختلف اسٹائلوں سے کچھ کچھ مختلف باتیں اخذ کر کے ایک جدا اسٹائل پیدا کیا گیا ہے، لیکن جب مرزا کی نثر کا ان دونوں کی نثروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے، تو مرزا کی کوئی ادا ان کی طرزِ ادا سے میل نہیں کھاتی۔

اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ مرزا کی نثر میں جو خصوصیتیں ہم کو معلوم ہوئی ہیں ان کو یہاں مفصل طور پر بیان کیا جاتا، اور ہر ایک خصوصیت مثالوں کے ذریعے سے ناظرین کے ذہن نشین کی جاتی، لیکن چوں کہ لوگوں کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دل بستگی نہیں ہے، اس لیے ہم اس بحث سے قطع نظر کر کے حسبِ وعدہ ان اصحاب کی ضیافتِ طبع کے لیے جن کو فارسی زبان کے ساتھ باوجود اس کی کساد بازاری کے اب تک کچھ نہ کچھ لگاؤ چلا جاتا ہے، مرزا کی نثروں میں سے بطور نمونے کے کچھ کچھ التقاط کرتے ہیں اور ہم کو امید ہے کہ

یہ نمونہ اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کافی و وافی ہوگا کہ مرزا نے نثرِ فارسی میں بھی اسی قدر بلند پایہ بہم پہنچایا تھا، جیسا کہ نظمِ فارسی میں ان کو حاصل تھا۔

اگرچہ مرزا کی نثر کو اگلے نامور انشا پردازوں کی نثر پر ترجیح دینا، تاوقتیکہ اس کو دلیل و برہان سے ثابت نہ کیا جائے، ایک بیمعنی بات ہے، لیکن ہم کو اُن لوگوں سے جو وجدانِ صحیح اور ذوقِ سلیم رکھتے ہیں امید ہے کہ وہ مرزا کی نثر میں ایک عجیب طرح کی لذّت اور شوخی اور ایک نئی طرح کا بانکپن دیکھیں گے، جس سے تمام متاخرین کی نثریں بالکل معرّا ہیں۔

چوں کہ مرزا کی طرزِ انشا پردازی سے اکثر لوگ ناآشنا ہیں، اس لیے جہاں تک ممکن ہوگا ہم ان کی نثر میں سے ایسے مقامات اخذ کریں گے، جو صاف اور سلیس ہوں۔ اور با ایں ہمہ جہاں ضرورت ہوگی، کہیں بین السطور میں، کہیں بریکٹ میں اور کہیں فٹ نوٹ میں حل طلب مقامات کی شرح بھی کرتے جائیں گے۔

مرزا کے تمام فارسی کلام کی املا میں ایک خصوصیت ہے، جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔ یعنی وہ بعض الفاظ کو تمام اہلِ زبان اور زباندانوں کے برخلاف دوسری صورت سے لکھتے ہیں۔ مثلاً صد کو سد، شصت کو شست، غلطیدن اور طپیدن کو غلتیدن اور تپیدن، گذشتن اور گذاشتن کو گزشتن اور گزاشتن، آذر اور تذرو کو آدر اور تدرو وغیرہ۔ چوں کہ یہ املا ناظرین کے تردد کا باعث تھی، اور نیز ہم اس املا کو صحیح نہیں سمجھتے، اس لیے اس کتاب میں جہاں کہیں مرزا کا کلام نقل کیا گیا ہے، وہاں الفاظِ مذکورہ قدیم معمولی طریقے کے موافق لکھے گئے ہیں۔

نثرِ فارسی کے نمونے

از مہرِ نیمروز

خطابِ زمین بوس

مہرِ نیمروز کے دیباچے میں حمد اور نعت اور مدحِ پادشاہ کے بعد ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف خطاب کر کے اپنا دردِ دل بیان کیا ہے اور اس خطاب کا نام خطابِ زمیں بوس رکھا ہے۔ اس کو کسی قدر حذف اور اسقاط کے بعد ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں:

قاآن شیوہ خاقاناؔ و خواقین خدائیگانا! روئے آوردنِ من از عدم بوجود بسودائے گہر سنجی و گہر فروشی بود، کالائے بیش بہائے من دریں چار سُو روئے روائی (رواج) ندید و متاعِ گرانمایۂ مرا دریں بازار ارزش (قدر و قیمت) ارزانی نہ شد۔ ناچار ہرچہ باخویش آوردہ ام چوں (چگونہ) گویم کہ باخویش می برم نہُفتے (انداختے) در سفینہ ہا و پارۂ (انداختے) در سینہ ہا می گذارم و می گذرم پس از من آں گنجِ شایگاں را گر ہمہ باد ببرد، گو ببرد و اگر ہمہ خاک بخورد، گو بخور۔ سینہ آرزو ہائے جواں (جوانِ مرگ) میرا مدفن ست، لمعۂ نگاہِ کرم (بالکل) چراغِ گورِ غریباں باد۔

نیاگانِ (اجداد) نامہ نگار از تخمۂ (نسل) افراسیاب و پشنگ بودہ اند، و فرماندہانِ بافرو فرہنگ۔ فرو مردنِ (بجھنا) چراغِ ہستی نورِ دیدۂ تور بہ بادِ آستینِ کینۂ کیخسرو و پشنگیاں (اولادِ پشنگ) را

؎ مرزا اکثر بلکہ تقریباً ہمیشہ، ان لفظوں کے بعد جن کے آخر میں واو یا الف ہوتا ہے، بغیر اضافت کے بھی تنہا کی طرز پر یائے زاید لاتے ہیں مثلاً رو یا سُو یا پا اور جا کی جگہ روے، سوے، پاے اور جاے لکھتے ہیں۔

روزِ سیاه پیش آورد۔ خداوندانِ اورنگ و دیہیم را ازاں برگ و ساز ہا جز تیغ گند ناگوں بکف نماند۔ بمرز و بومِ بیگانہ روی آوردند، و بدستِ مزدِ تیغ زدن نان خوردند۔ ہم ازیں نیستاں ابوانانِ کہسار نشیمن، سلجوقیاں دگر بارہ سر بافسر و افسر بگوہر آراستند۔ چرخِ گردندہ چنانکہ خوی اوست ایں نامدارانِ کادس کوس را نیز از پای افگند:

در مشربِ ما خواہشِ فردوس نجوئی	در مجمعِ ما طالعِ مسعود نیابی
در بادۂ اندیشۂ ما دُرد نہ بینی	در آتشِ ہنگامۂ ما دُود نیابی

از والیسانِ ایں قافلہ نیاپے بُن کہ قلمروِ ماوراء النہر، سمرقند شہر، مسقط الراس وے بود، چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید، از سمرقند بہند آمد۔ در دفترِ سپہبد شاہ نشان ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خان تو قیعِ نوکری شاہش نوشتند و پرگنہ پہاسو براتِ روزیِ وے و سپاہش نوشتند۔ پدرم پیشۂ پدرِ خویش داشت، و ہم در کارزار جامہ گزاشت۔ ہمانا گلبنِ نسلے نزا نوآیین نوا بلبلے ہمی بایست کہ مرا زمزمہ سنج و دستاں سرائے آفریدند۔

رباعی

غالب بگہر ز دودۂ زاد شمم	زاں رو بصفاے دمِ تیغ ست دمم
چوں رفت سپہبدی، ز دم چنگ بشعر	شد تیرِ شکستۂ نیاگاں قلمم

خاکم بسرکہ بغریبِ پندار آزادہ روی بسخن لاابالیانہ پرداختم، و اندازۂ ارزشِ سخن و پایۂ والائیِ گوہرِ خویش نشناختم۔ سینۂ من نفسے داشت بروانِ آسائیِ نسیمے کہ از نسترن زار وزد، بازیاں زدہ۔ من کہ دم جز بہ نابایست نہ زدم، و بنانِ مرا قلمے بود بہ دجلہ باریِ ابرے کہ از قبلہ خیزد بیہدہ کوش۔ من کہ باراں بشورہ زار فرو ریختم۔

بااین فروغِ گوہر درخشانی نہاد   زیں سان سیاہ روز کرا کرد روزگار

بافرّ و فرہنگ بیگانہ، و با نام و ننگ دشمن، با فرومایگان ہمنشیں و با اوباش ہمرنگ، پائے بیراہہ پوے و زبانِ بے صرفہ گوے، در شکستِ خویش گردوں را دستیار (مددگار)، و در آزارِ خویش دشمن را آموزگار، دل پُر از خار خار، و دیدہ نشتر زار، نہ دستگاہِ خودنمایانہ آرایشے، و نہ سر و برگِ آزادانہ آسایشے۔ سرگذشتِ ہرکس ہماں فرمان ہاے امضا پذیرفتہ، سرنوشتِ اوست؛ در آنچہ برمن رفت، دوستاں را با من چہ جای سرزنش، و مرا با دشمناں چہ گنجائیِ (گنجایش) پرخاش۔

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست موج   دانا خورد دریغ کہ نادان چہ کار کرد

پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیزیِ رفتارِ من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت، و خانقاہ و میکدہ را بیکدگر زد، بفروغِ آں فرّۂ ایزدی کہ فریدوں را بہ فرتاب دادگری دل افروخت، و مرا فرہنگِ سخن گستری آموخت، بداں ؎ در فرودم آوردند کہ تو نیز چوں حلقہ، چشمے بداں در داری، و نتوانی کہ دیدہ برداری.... تا ہمسایۂ اُویم، سپہریاں در سایۂ من اند۔ و تا خاک نشینِ آن دَرَم، فرشتگاں در رشکِ پایۂ من اند۔ در دل و دیدۂ روشناں جاے من ست و بر سر ماہ و ستارہ (ستارگان) پاے من۔ دریں گوشہ گزینی و خوشہ چینی نخست آیۂ رحمتے کہ برمن از بالا فرود آمد، رُو دادنِ خجستگیِ زمیں بوس گیہاں خدیوِ خدا دان بود۔ دولت رُو آورد، بخت از خواب جست، حور چشم روشنی (مبارکباد) گفت، رضوان بہ رضا جوئی آمد، چرخ از رفتہ عذر خواست، روزگار از گذشتہ بحلی (معافی) طلبید۔

؎ اس در سے میاں کالے صاحب کا دروازہ مراد ہے جو بہادر شاہ کے پیر تھے اور مرزا اُن کے مکان میں رہتے تھے۔

نومیدی از تو کفر و تو راضی بہ کفر
نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

کالبدِ خاکیِ مرا چوں پیکرِ گردِ بادِ جانے در میان نیست؛ ہمیں یک دو دمہ سرگشتگی تماشا دارد۔ مگر عندلیبِ گلشنِ تصویرم کہ بوے گل زمزمہ از وے نتواند دمید، یا سبزۂ جوہرِ شمشیرم کہ بوزیدن بادِ مستانہ نیارد چمید۔ گسستگیِ پیوندِ نشاط کہن شد، و خون از دل ہمچناں در چکیدن ست، تا پیوند چہ قدر استوار بود؟ و چہ مایہ بزور گسستہ اند

شبے با دلِ دیوانہ کہ نخستے ازمن ہوشمند تراست، گفتم کہ اگر گفتار نبودی، لمشاہِ ارم کارگاہ بارگاہ عرضہ دارم کہ آئینہ رازم، مرا می تواں زدود؛ و بندۂ سخن طرازم، مرا می تواں پرور، گفت، اے ناداں! ایں سخن از جاے دگر بود وہنگامِ آں گذشت؛ اکنوں اگر ہمی توانی گفت بگوے کہ خستہ ام، مرہم می تواں نہاد؛ و مردہ ام، جاں می تواں بخشید۔

رباعی

شاہا! ہر چند داد جوے آمدہ ام
دانی کہ چہ مایہ نغز گوے آمدہ ام
آبم کہ محیط را بجوے آمدہ ام
رنگم کہ بہار را بہ روے آمدہ ام

اگر چنانکہ بدورانِ تو ام، بروزگارِ زرانہ جمشید بودے، جمشیدِ روزگار را آفریں گفتے؛ و اگر بدانسان کہ ثنا خوانِ شہریارم، فرخ فریدوں را ستودے، فریدوں چرخ و ستارہ را گرد سر گشتے۔ دراں انجمن کہ زردشت آتش افروخت، و ژند آورد، اگر من بدیں دم آذر فشاں جا داشتمے، آذر از بیم من زبانہ نزدے۔ و از دلفریبی بیانِ من کس بشنیدنِ ژند نپرداختے۔ من بدیں فرخی بخت کہ چوں تو خداوند کارفرمائے دارم، ہر قدر بر خویشتن بنازم، جا دارد، سرت گردم! تو نیز بدیں گرمیِ ہنگامہ بناز کہ ہمچو غالب بندۂ آتشیں نواے داری۔ اگر بہ اندازِ ہنر دادِ التفات می دہی، جاے مردمکِ دیدہ بمن باز گزار؛ و درِ دل بروی من بکشاے۔

گویند، در عہدِ جہانبانیِ حضرتِ صاحبقرانِ ثانی (یعنی شاہجہاں) بغربانِ آں خسروِ دریادل کلیم را مدرہ بسیم و زر، لعل و گہر سنجیدہ اند۔ من آں خواہم، دیدہ وراں را دستوری دہی تا از کشش و کوشش نہ رنجند، (تنبیہ ۱) و یکبار گفتارِ مرا با کلامِ کلیم بسنجند۔

پریشاں نوائیِ من در ستایشِ گفتارِ خویش اگر خودگزاف نباشد، گفتار راست بگستاخی گزاردن ہم از انصاف نباشد۔ آخر نہ ہمانم کہ ہمہ وقت خود را ہیچ شمردمے، و ہیچ گاہ برخود گمانِ کمالے نبردمے۔ سرمستیِ ذوقِ برگزیدن ایں والانظر کہ برگزیدۂ تست (یعنی حکیم احسن اللہ خاں) مراازمن برد، و خامۂ بے پروا پوے را بدیں روش و آہنگ بخرامش و رامش آورد ..... ہمانا بلند نامی سلطانِ دہر در آفاق چشم داشت کہ چوں منے را کہ بجادو بیانی شہرۂ آفاقم بکردارگزاری گماشت۔ من خود از آں رو کہ دل و زبانِ ایں بیدار مغز (یعنی حکیم) آیینہ دارِ دل و زبانِ شاہ است، دانم کہ آنچہ عمدۃ الحکما دریں باب بمن فرمودہ، فرمانِ شاہ ست۔

بادشاہاں را ثنا گفتن نہ کارِ ہر کس ست دیدہ در شاہے کہ کارِ گفتن انداز دبمن

نامہ نگارِ کردارگزار را بہ تنومندیِ توفیقِ سرانجامِ خدمت، سعادتِ جاودانی، و خاقان را بہ سایۂ سوادِ ایں نگارش کہ ظلماتِ آبِ حیواں ست، حیاتِ پایدار ارزانی باد۔

فخریہ فقرے مرزا نے مہرِ نیمروز میں جہاں سببِ تالیفِ کتاب لکھا ہے اس کے آخر میں یہ ظاہر کیا ہے کہ کسرِ نفسی کی معمولی رسم کے برخلاف اگر میں اپنی طرزِ بیان کی داد لوگوں سے چاہوں، تو یہ کوئی بیجا بات نہ ہوگی، بلکہ عینِ تنقید و تمیز کی بات سمجھی جائے گی۔ اس کے بعد کہتے ہیں:

کالاشناسی را نہ آں آیین ست کہ نکوئیِ کالائے خویش از نظر اندازند، و ہر کار

---

۱ خاندانِ تیموریہ کی تاریخ نویسی کے لیے مرزا کو حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے تجویز کیا تھا۔ یہاں اسی مضمون کی طرف اشارا ہے۔

کشائی را نہ آں دستور است کہ بر سرِ ہر پیکرے کہ خود کشند، عشق نہ بازند۔ نگر بانیِ آں نقش را کہ خود می زدہ از اعجاز نمی شمرد ہمو آذر آں بُت را کہ خود می تراشید نماز نمی برد؟ یزداں را بندۂ سپاس گزار باشم، اگر قلم را بہر جنبش آفریں نگویم، و از سخن بہر اندیشہ سپاس نہ پذیرم۔ رفتارِ کبک و تندرو دل از دست برد، و خرام ایں رعنا لعبتِ رقاص سرمست نکند؟ حاشا کہ خرامشِ کلک بر ورقِ ایں مایہ ذوق انگیز تواند بود تیر سنت کہ بہ بند در حالتِ سرمستی تصمیم خود نمایانہ بنازمی خرامد۔ ایں پارسی آمیختہ بہ تازی کہ از زبانِ چیرہ دستیِ عرب بر عجم در گیتی پدید آمد، خسروی گنجینۂ در بستہ بود کہ خامۂ من قفلِ درش را کلید آمد۔ پرویز کجاست تا بنگرد کہ دریں رہروی کدام رہ سپردہ ام، و بہرام کجاست تا فرا رسد کہ سخن را از کجا بکجا بردہ ام:

خسروی بادہ دریں دور اگرے خواہی   پیشِ ما آے، نہ جرعۂ از جامِ مست

خود ستائی فرو ہلم، و بندِ پندار بگسلم۔ آوخ، از آں روزگار کہ از خوی بنا سازی و از کار ربازی سپری شد؛ و داد ازاں بیداد کہ در ورزشِ افزونیِ خشم و کام برروان و ہوش رفت۔ از کار فرمائے ایں نگارش سپاس پذیرم کہ بپرداختن ایں نمط کہ خود را چوں سایہ با زمین ہموار ساختہ ام، تا پرداختہ ام، و بانگیختنِ ایں نقش کہ چشم و دل و نگاہ و نفس باہم آمیختہ ام، تا انگیختہ ام۔ دست از کار ہائے دگر کوتاہ است و دل از اندیشہ ہائے دگر بر کنار۔ نامہ نگار کہ از کردار گزاری بگفتنِ دردِ دل روئے آوردہ بود، باز بہ پائے سخن می آید و جادہ کہ نشان دادہ اند می پیماید، نگرندگان ہمہ تن چشم باشند،

۔ تصمیم اور احتراق منجمین کی اصطلاح میں دو متقابل لفظ ہیں جب کسی ستارے کا فاصلہ مرکز آفتاب سے ۶ درجہ ہو تو کہتے ہیں کہ یہ ستارہ احتراق میں ہے اور جب یہ فاصلہ ۱۶ دقیقہ یعنی بہ نسبت احتراق کے ۴۴۳ دقیقہ کم ہو تو کہتے ہیں کہ تصمیم میں ہے۔ الغرض ستارے کا تصمیم میں ہونا اس کی عمدہ ترین حالت ہے۔

دِ شنوندگان سراپا گوش

طرزِ واقعہ نگاری مرزا نے مہر نیمروز میں جس طریقے سے واقعات تحریر کیے ہیں، یہاں دو ایک مثالیں اس کی بھی لکھی جاتی ہیں:۔

از روبداد قبل خان کہ از نیاگانِ امیر تیمور بود

خانِ خطا با خویشتن سنجید کہ با قہرمانِ قومِ مغل مہر ورزد، مہر انگیز نامہ رواں داشت، و گزیدہ روشنے را بہ نامہ بری و میانجی گری گماشت۔ فرستادہ آمد و جہان پہلوان قبل خان را زمین بوسید، و نامہ سپرد و پیام گزارد۔ صرفہ در آشتی بود نہ در فروگذاشت۔ تاجولی بہادر را بجائے خود نشاند و بہمعنانی نامہ آور توسنِ تیز گام سوئے خطا راند، و فرمانروائے آں کشور سرانِ لشکر را پذیرہ فرستاد، و مہمان را بخوشترین نشیمن فرود آورد۔ و پادشاہِ سپہر بارگاہ بر یک خوان نشستند و نان خوردند، و راوق آشامیدند۔ مگر خرد پیشہ قبل خان را در اندیشہ گذشتہ باشد کہ مبادا خطائیان زہر بہ بادہ آمیزند، و بدیں رنگ خونِ مہمان ریزند، در ہر بزم پس از اندک مایہ درنگ بہ بہانۂ آب تاختن بیروں آمدے، و بہ ستم شگوفہ کردے، و خوردہ و آشامیدہ از دہن فروریختے۔ چوں بہ بزم اندر آمدے، دگربارہ ساغر گرفتے، و خوردنی از سر گرفتے۔ خطائیاں بہ شگفت فروماندہ کہ یارب! ایں چہ نبرد مند و زور آور کسی ست کہ از ما بیشتر میخورد و خورش را بروئے گرانی نبست، وے از ما فزوں تر میکشد و ہشیار تر از ماست۔ میکشاں دانند کہ چوں بادہ پر زور دمادم خورند، ہر چند ہر بار شگوفہ اندازند، نہ آنست کہ مستی روئے ندہد، و تابِ مے در زبونیِ تن منش را بہم بر زند۔ شبے بادہ بر خرد زور آورد۔ قبل خان ریشِ دارائے خطا کہ التان خان نام داشت گرفت و بسوئے خود کشید و ناسزا گفت۔ میزبان خشم فرو خورد، و نزدیکانِ خود را کہ بہم برآمدہ بودند، از گستاخی باز داشت۔ بامداداں مہمان آہنگِ بازگشت سرود۔

میزبان کہ از بدمستی دوشینہ سرگران بود، چنانکہ میزبانان دامن میہمان زود
از دست ندہند، و آرزوے دیر ماندن کنند، نکرد۔ کلاہ ہاے گوہرآگین،
و کمرہاے زرین، درخشندہ نگین ہاے بیش بہا و برلیتہ ہاے پرنیان و دیبا
پیش کشید، و پدرود کرد۔ ہنوز رہرو دور نہ رفتہ بود کہ بدآموزان ایشان
خان را از جاے بردند، و براں آوردند کہ قبل خان از راہ برگردانند، و بدرگاہ
آوردند، و کالبدش را بدشنہ و خنجر ازہم فروکشایند۔ سخن بہ نرمی گزارندۂ ستارہ[1]
از سپہر فرود آرندہ۔ بدیں کار کمر بست و قبل خان را براہ دریافت، بباز آمدن
فریفت۔ رمیدہ رام نہ شد، و از راہ برنگشت۔ فرستادہ تنہا باز آمد و بفرستندہ
خبر داد۔ بگروہے از گُرذان و یلان فرمان رفت کہ جلو گسیختہ شتابند و
ہر کجا یابند اگر بشادی و رادی نیاید، بخواری و زاری آورند۔ مگر قبل خان
را براو دوستی بود از دودۂ ستودۂ سلجوق، بکاشانۂ وے فرود آمد۔
دانم از بہرِ آسایش آہنگِ دو سہ روز آبخور داشتہ باشد، خطائیانِ شوریدہ
مغز دراں دِہ رسیدند و خان را دراں خانہ دیدند۔ سخن بداں لابہ ساز کردند
کہ خاقان فریب خورد، و خواست کہ سُوے خطا برگردد۔ خانہ خدا کہ خرد از
مہر فزوں داشت، نہفتہ بادپاے پیش کشید و گفت، کارہا دگرگوں ست؛
رفتن بخطا خود بہیچ رُوے روا نیست۔ تنہا بدیں گروہ میاویز، و بریں بادِ
توسن نام برنشین، و سوے ایل و اولوس بگریز۔ ناگزیر ہمچناں کرد، و
جانِ گرامی بہ تیز گامی بُرد۔ خطائیان روے بازگشتن نداشتند[2] پےِ امیدگاہ

---

۱ یعنی کسیکہ بلطفِ زبانی و حیلہ سازی ستارہ را از سپہر فرود آورد

۲ پے برداشتن تعاقب نمودن امیدگاہِ تگاپوے خویش یعنی کسی کہ در طلب او تگاپوی نمودند

تگاپوے خویش، بر داشتند۔ خانِ سپہر آستان نخست بآرامش جارسید و خطائیان سپس
یعنی ازپس وے
بافاجولی بہادر و فرزانگاد لشکر سگالش رفت کہ چہ می باید کرد انجام کار بہ بہدید
صوابدید
یکدگر بدخواہاں راآشتند، تاازنخمیکہ کشتند چہ درونند۔
یعنی دیکھیے اس حرکت کا انجام کیا ہو
شہریار قبل خان از یک بانوے نکو دیدار کہ از قوم قنقرات بود، شش
پسر داشت۔ نخستیں و دومیں بہ اوگین برقاق و قوبلہ خان نام آور، و دیگراں
بہ نام ہای دگر روشناس۔ روزے نخستینِ ایں دو برادرِ نام آور ناگاہ بہ شکار
گاہ از ہمرہاں جدا ہمی ماند، وراہ گم کردہ ہرزہ ہمی گردد۔ تاتار خانیاں کہ
غارتگری پیشہ داشتند، و پیرامنِ قلمروِ مغول ہموارہ راہ می زدند، باایں شہسوار
پریشاں رفتار برمی خورند، و چوں می دانند کہ کیست باسیری می برند و باتان خانِ
خطائی می سپرند۔ خان کہ دلے پُرداشت، فرماں می دہد کہ شہزادہ را بر خرِ چوبیں
یعنی بھرا بیٹھا تھا
بہ میخ ہاے آہنیں بردوزند، و تنِ نازنینش از رواں پرداز ند۔ خداوندِ مغولستان
یعنی قبل خان
راکہ از پیش رنجور بود، بجگر تابیِ ایں داغ دردافزود۔ چوں دانست کہ ناکام
ہمی باید مُرد، دومیں پسرِ خویش قوبلہ خان را بہ جانشینی گزید۔ و بہ کشیدنِ
انتقامِ خونِ برادر وصیت کردہ، چشم از تماشاے جہاں پوشید۔ قوبلہ خان
تانگینِ سلیمان بکف آورد، بفراہم آمدنِ سپاہ فرمان نبشت۔ فرماں براں و
کینہ خواہاں از ہر سُو بہ تختگاہ رُوے آوردند:

شہنشاہِ دانا دلِ دیدہ ور — کہ چوں لعل بودے سراپا جگر
بداں شد کہ لشکر فراز آورد — بسوے خطا ترکتاز آورد
زمردان وگُردان وکندآوراں — بہ جنبش درآورد کوہے گراں
ازاں رو کہ بایست خونریز شد — منش ہا بخوں ریختن تیز شد
بہلواناں
یعنی اس وجہ سے کہ خونریزی ہونا ضرور تھا
دلیراں ز دشمن کُشی دم زدند — زدم باد بر رُوے پرچم زدند

زتاتار تا گرد انگیختند　　به بنگاهِ خانِ خطا ریختند

النان خان دل و دست و عنان و سنان بکار آورد، و خود را با سپاہے از ستاره بشمار افزوں تر، به پیکار آورد۔ کوشید و کوشیدن سُود نداشت، رقمِ فیروزی بنامِ قوبلہ خان کشیده بودند۔ شکیبائی گسل شکستے برخطائیان افتاد، عَلَم ہا داژگوں شد، و اندیشه بگریز رہنمول۔ جہان بان النان خان بگریختن جاں بُرد، و تن ہاے خسته و دلہاے شکسته از میاں بُرد۔ بشہر اندر آمد، و در برُوے سپاہِ کینه خواه بست۔ قوبله خان و لشکریانش نه آنمایہ برگ و ساز به یغما ربودند که در اندیشه گنجد۔ سپاس گزارِ چرخ و اختر گشتند و گرانبار و سبک عناں برگشتند۔ پادشاه بچشم روشنی پیروزی سپاه رعیت را صلاے عشرت اندوزی داد۔ ہنگامۂ جشن گرمی پذیرفت و بزم شور آرائش یافت۔ خواہی ہنگامہ گرم کن و خواہی بزم آراے؛ مرگ را نه آں خدنگ به کمان ست که خطا کند؛ قوبله خان را نیز بہنگامِ خویش ناوک برنشان خورد۔ چوں پسر نداشت برتان بہادر جاے پدر از برادر گرفت۔ بسکه دلیر و مردانه بود، نامش از خانی به بہادری در جہان رفت۔ بروزگار جہاندارئ ایں شہریارِ دلاور، برقِ اجل، خرمنِ ہستئ قاجولی بہادر سوخت، و پسرش اردمچی برلاس لسبرلشکری رُخ افروخت۔

پارهٔ از احوال امیر تیمور

روزے میانۂ امیر قرغن[1] و امیر طراغاے[2] درباره اولوس و قشون سخن می رفت و فرزانۂ فیروزی فر امیر تیمور دلاور با پدر ہمزباں بود۔ پدر را از گفتار باز داشته خود بشگرفی سخن سراے شد، و دیداں ہنجار نغمۂ چند برتارِ

---

[1] امیر قزغن نام یکے از امراے چغتائیه　[2] امیر طراغاے نام پدر امیر تیمور

گفتار زد کہ امیر قزغن دراں شیوا بیانی و گہرافشانی بمہر دل بست و باآفرین زباں برکشاد۔ سخن گوے فرو بیدہ ادا را پسر خواند، و ہمدراں بزم اولجایو ترکان خواہر امیر حسین نبیرۂ خویشتن را بآئینِ دین و قانونِ شرع بوے سپرد۔ تا خویشی بر خویشاوندی افزاید و آمیزشے چوں شیر و شکر درمیان آید۔ امیر جہانجوے پس ازاں پیوستہ باامیر قزغن در بزم ہمنشین و ہمدم و در رزم پیش تاز و پیش آہنگ بودے۔ از نبرد آزمایانِ برلاس و دلاورانِ چغتا ہر کہ آں دست برد نگرستے شگفتی فروماندے "و زنستت مریزاد" گویاں دست و بازو آفریں خواندے۔ پس از امیر قزغن کہ دامادش تغلق تیمور ناگاہ در شکارگاہش کشت، جہاں پہلوان تہمتن تواں بہ تنہا دامن ہمت والا گرفت و در تیغ زنی و خصم افگنی کارش بالا گرفت۔

ہرچند کہ زشت و ناسزائیم ہمہ — در عہدۂ رحمتِ خدائیم ہمہ

در جلوۂ دید چناں کہ مائیم ہمہ — شایستۂ لعنت و بوپائیم ہمہ

برادرِ زنِ صاحبقراں ہمانا امیر حسین نیز بوے پیوست و عہد بست کہ ہرچہ از ملک و مال و برگ و ساز گرد آید، بریکدگر بخشش کنیم۔ و باہم جز مہر، و با قوم جز آزرم، و با خلق جز داد نہ ورزیم۔ بخوں گرمی ایں دو گردِ دلاور و دو شیر مردِ ہم گہر ہنگامہ گرمی پذیرفت، و گزیں دستگاہے و سترگ سپاہے فراہم آمد۔ صاحبقراں نہ از سادگی بلکہ از آزادگی دل با زباں یکے داشت و امیر حسین ہموارہ در کمینِ آں بودے کہ انباز را از میان بردارد، و بیکتائیِ علم دارائی افرازد۔ از دیدہ وری بسگالشہاے آں نژند اندیشہ ناراستی پیشہ پے بُردے و از فرزانگی و مردانگی ہیچگاہ برو نیاوردے۔

سے یہ رباعی گویا آئندہ آنے والے مضمون کی تمہید ہے۔

ستم بجانِ کج اندیش می تواں کردن   خجل ز راستیِ خویش می تواں کردن

روزگارے دراز تراز رشتۂ طولِ امل، با ملوکِ طوائف در کجدار و مریز و ستیز و آویز گذشت۔ ہمگناں چشم براہ و گوش برآواز داشتند، تا ایل اسفندیار (یعنی تیمور) نبرد را از کدام سو چشم زخم رسد۔ ویژہ امیر حسین کہ جز بریو و غریو درنگ و نیرنگ کار نمی کرد، و در انبازی و (خصوصاً) دمسازی، فتنہ پردازی و شعبدہ بازی شیوہ داشت۔ نیرنگ سازیِ اقبالِ عدو مالِ (یعنی دردمستی) صاحبقرانِ کشورستان را نازم کہ ہم آں گروہِ بے شکوہ را سو بسو پائے بسنگ خوردے، و ہم ایں گردے دستبُرد را جا بجا دست از کار رفتے۔ صدرہ اتفاق افتادہ است کہ ایں نفاق پیشگانِ خرد دشمنِ (یعنی امیر حسین) خوں گرفتہ، را از نژادِ چغتا خان دست گرفتہ برتکیہ گاہِ خانی و مرزبانی فشاندہ اند، و زود زیر شمشیر برزش ماندہ اند۔ تنہا پیلتناں را مسند و نطع از پئے ہم مہیا بود، و سرہائے سرداراں را نازِ بالش و خشتِ گور از پس یکدگر آمادہ:

سیرِ ستارہ و روشِ چرخِ نیلگوں	اینہا کند ہر آئینہ در مذہبِ حکیم
اما من آں نیم کہ پسندم طریق وہم	زاختر چہ شکوہ، چوں نبود جز خدا قدیم
نبود بجز ظہورِ صفات و شیونِ حق	صلح و نبرد و فتح و شکست و امید و بیم
توقیعِ معتولیست گر انصاف، ور ستم	تشریفِ خسرویست گر اطلس، وگر گلیم
از حق بود اضافۂ ہستی بہر صفت	جز دایہ نبود آنچہ بہ سائل دہد کریم

ہمچنیں بارہا امیر حسین را از درماندگی و زبونی کار سخت افتادہ است و سلطان سام (صفت اول) ہم آورد، افراسیاب ہمتا (موصوف)، بر لابہ گریِ وَے بخشودہ (منقطع) بیاری و یاوریِ دل نہادہ است۔ (صفت ثانی) کینہائے نہانیِ امیر حسین آشکارا بود۔ ہمہ می دانستند، و خدیوِ ہمہ داں از ہمہ فزوں تر می دانست۔ دانم کہ در ضمیرِ حق پذیر، آزرمِ ناگزیر، می گزشتہ باشد کہ مگر ایں سست مہر

خوہاے زشت و کردار ہاے نکوہیدہ بگذارد و جہاندار را دگر بناراستی و جہانیاں را پس بہ درازدستی نیازارد۔ آں ناجوانمرد را فرۂ ایزدی کجا کہ بخشم و کام نگردد، و راہِ دانش و داد رود۔ در آزردنِ دل آزرم نداشت و در بُردنِ زر شکیب، (یعنی خواہشہاے نفسانی) و در کشتنِ خلق پرواہ

تو پارسا طلبی عاشق و مگن آں رندم | کہ مے بحلقۂ اوباش آشکار کشد

پایانِ کار لشکر پانش از ناخوشی ستوہ آمدہ، آں جواں میر، خداگیر[۵] را با ہر چہار پسرش گرفتہ آوردند، بخداوندگار سپردند۔ دارا ے نبرد آزماے را آہنگِ عاجز کشی نبود و خون گرمیِ پاداش (یعنی جوشِ انتقام) نداشت۔ می خواست بر نابخشودنی بخشودن، و گناہاں نابخشیدنی بخشیدن؛ از نہادِ اہلِ بزم خروش برخاست۔ خاصہ شاہ محمد مرزبان بدخشاں، و شیخ محمد بیاں، سلدوز، و امیر کیخسرو کہ ریشہاے نو و ناسورہاے کہن داشتند۔ زخمہ تیز تر زدند، و تبواہاے خونچکانِ خونابہ فشاں فغاں برآوردند کہ ما قصاصِ خونہاے ریختہ می خواہیم، نہ انتقام فتنہ ہاے انگیختہ کہ والیِ ولایت آں اِبحل تواند کرد۔ ناگزیر بدیں گفتار فرجامِ گیر و دار بشرع حوالت رفتہ۔ کار آگاہاں و دانش پناہاں خون ریختن فرمودند، سادات و علما بہ کشتن فتویٰ دادند۔

پنداری چوں خوں گرفتہ اینہا شنیدہ باشد در دل اندیشیدہ باشد کہ خود را اگر ریختن از ہنگامہ بدر برد۔ و سپس در زاویۂ گمنامی کہ ہمسایۂ نیستی ست روزگار بسر برد۔ از آنجا کہ سلاح و سلب نداشت، سراسیمہ از جا رفت، و از خرگاہ بدر آمدہ بجنگِ سیلی و مشت رہِ گریز پیش گرفت۔ خون خواہاں بخوں گرمی دروے آویختند، و خونش را کہ بدویدن گرم شدہ بود، گرما گرم بر زمیں ریختند۔

تو ای ندیم کہ مانی ز تازہ روئیِ خویش | بسبزۂ کہ سر از طرفِ جوئبار کشد

---

۵ خداگیر کسیکہ بغضبِ خدا گرفتار شدہ باشد

فریبِ مہر زگردوں مخور کہ ایں بے مہر — دہد فشار کسی را کہ در کنار کشد
ہوائے تاجِ شہی ہر کرا بود در سر — سرے بمدفنِ شاہانِ تاجدار کشد

پارۂ از احوالِ ہمایوں و شیر شاہ

شیر خان را دل دگر بود و زبان دگر، بہ لابہ گری و فسون گستری پیامِ آشتی درمیان داشت، تا چناں شد کہ ہیچ کس را ستیزہ در اندیشہ نگذشتے۔ از آں گل و لائے[1] کہ در راہ پیمودہ بودند، و روز و شب از رہروی، نے نے از شناوری، نیاسودہ بودند، پیادہ آزردہ پاے بود، و سوار فرسودہ اندام، و ستور پشت ریش۔ فریبِ دوستی از دشمن خوردگان (یعنی ہمایوں و لشکریانش کہ فریب از شیر شاہ خوردہ بودند) دست از غارت و تاراجِ غنیم کشیدند، و دمِ آسایش غنیمت شمردند۔ پا ہا بہ جادۂ زہ دامن[2] آشنا شد (یعنی پا بدامن کشیدہ بخواب رفتند) و پیکر ہا چوں صورتِ دیبا را پیوند پذیرفت۔ سر از بالش بر نمی خیزد تا کلاہ و مغفر را چہ کنند، و پیراہنِ حریر بر تن گراں ست تا چلقد[3] و جوشن کجا برند۔ ہوا نمناک بود، و ابر رشحہ فشاں، تیغ در نیام زنگ بست، و نمدِ زیں بر بارگی گراں گشت۔ سپیدہ دمے کہ تیرگی تار میغ جہاں را فرو گرفتہ بود ہنگامہ سازاں[4] ہنگام جوے یکسرہ بر غنودگان ریختند۔ شگرف سراسیمگی پدید آمد و طرفہ ہزاہز در لشکر افتاد۔ کلاہ از کمر[5] و پاردم[6] از افسار نشناختند۔ از رختِ خواب جستہ و بر اسپانِ بے زین نشستہ، پراگندہ ہر طرف تاختند۔ گروہے "ہرچہ بادا باد" گویاں سوارہ خود را بدریا زدند و ہر دو سہ چند ساحل جویاں بہ شنا دست و پا زدند تا کداماں بزخمِ دمِ تیغ و کداماں بہ خمِ موجِ رود مُردہ باشند

۱۔ یعنی از شناوریِ گل و لائے ۲ کنارۂ دامن ۳ چل ۴ یعنی لشکرِ شیر شاہ
۵ پٹکا ۶ دُمچی ۷ باگ ڈور

کدہاں از طوفانِ ایں دوآبہ (یعنی آبِ تیغ وآبِ رُود) جاں بسلامت بُردہ باشند۔ شہنشاہِ بحرہ بردہمایوں) نہنگِ دشت نورد دریاشگاف (یعنی اسپ) راازفرازِ ساحل درآب افگند۔ پلے ازرکاب، وعناں ازدست، واسپ از خمِ ران بُدر رفت۔ وشاہ سوارے کہ شاہان ہنگامِ سواری بوسہ بررکابش می زدند، غوطہ درآب خورد۔ نظام نام آزادۂ ازآب کشانِ لشکر کہ پنہاں ازخویش اقبال راچشم براہ وگوش برصدا داشت (یعنی بے آنکہ خبرداشتہ باشد، منتظرِ عروج واقبالِ خودبود) وباخویشتن دریں اندیشہ کہ از ساحل چوں گزرد، برساحل جاداشت، ہواخواہانہ بداں جستی، کہ گوئی گوے دولت بُرد، خودراباب درزد۔ بارے بدانستِ آشکارابیناں سقاے سخت کوشے بود؛ دیدہ والادید معنی آشنایان فرخ سرد شے بود کہ جہانبان را از گرداب بدرآورد و بر جہانیاں منت نہاد۔

از دستنبوہ

اگرچہ مرزا کی نثر میں عموماً عربی الفاظ بہت کم آتے ہیں، لیکن کتاب دستنبوہ میں جو غدر کے حالات پر مرزا نے لکھی ہے، التزام کیا گیا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ نہ آنے پائے۔ باوجود اس سخت التزام کے مرزا نے دستنبوہ میں اپنی طرزِ خاص اور شاعرانہ ادا اور بانکپن کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چناں چہ نمونے کے طور پر دستنبوہ کے چند فقرے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں:

غدر کے اسباب

دریں روزگار کہ ہر زمزمہ راہنجار وہرہمہمہ رارفتار، وہر کجا سپاہے بود از سپہدار، سخن بپیوندی بگذار وبگوے کہ خود روزوروزگار، برگشت۔ اخترشناسانِ سپہرپیماے (یعنی منجمان) برآنند کہ دراں روزگار کہ بزمِ نازبیزد جُرد شہریارِ پارس از ترکتازِ تازیاں (اہلِ عرب) بہم خورد۔ کیواں (زحل) وبہرام (مریخ) درخرچنگ

(برج سرطان) انجمن آرائے و ہنر آزمائے بودند۔ اینک ہماں پایۂ (درجۂ) سیزدہم از خرچنگ ہمچناں بہم پیوستن گاہِ (جائے قران) بہرام و کیوان ست و ایں شورش و پرخاش و جنگ و خواری و خونخواری، و رنگ و نیرنگ نمایۂ (ظہورِ) آنست۔

دانا بدیں گفتار کے گرود؟ آں تاختنِ لشکرے دیگر بود از کشورے دیگر، وایں برگشتنِ لشکر ست از خداوندانِ لشکر، چناں کہ از داستانِ باستانِ پارسایانِ پاک بہم نمانستن (عدم مشابہت) ایں دو ستیز و آویز ہویدائی دارد۔ دراں بار کہ سخن در کیش بود، ایرانِ ویران بہ فرّہ و فرہنگ کیشِ نو (یعنی اسلام) فرجامِ آبادی و از بندِ آذر بندگی (آتش پرستی) آزادی یافت۔ درایں بار کہ گفتار در آئین ست، ہندیاں بہ چشمداشتِ کدام آئینِ تازہ شادماں باشند؟ پارسیاں رُخ از آتش تافتند، و بسوئے خدا راہ یافتند۔ ہندیان دامنِ دادگراں (یعنی اہلِ فرنگ) از دست دادند، و بشکنجۂ دامِ ہمدمیِ دداں (درندگان) افتادند۔ نمی بینی کہ از دامن تا دام و از داد تا دَد چہ مایہ دوری ست، داد آنست کہ آرامش (راحت) مجز در آئینِ انگریز چشم داشتن کوری ست۔ زخمِ تازیانۂ تازیاں از خوبیِ آں کیشِ فرخ (اسلام) مرہمے داشت، روزگار در نوردِ ایں خستگی (یعنی غدر) خجستگی اگر میداشت، بارِ اندوہ از دوشِ دلہائے نژند (پریشان و تباہ) برمی داشت۔ اگر در اندیشۂ رازداناں بہ ہر دانش و داد، ازیں پس پیش آمدے (بہبودی) ہست، بمن نشان دہند، و بر دلِ اندوہگینِ بیمناک سپاس نہند۔ جہانیاں با جہانباناں ستیزند و لشکریاں خونِ لشکر آرایاں ریزند؛ وانگاہ شادی ورزند، و بر خویشتن نہ لرزند۔ ہاں، اے دانندگانِ فرزبود (حکمتِ الٰہی) و شناسندگانِ زیان و سود! ایں ہنگامہ بہ آتشِ خشمِ خداوند گرم است ورنہ کارزارِ پارس اینچنیں امید سوز و آرزو گداز نہ بود۔

کیفیتِ شورشِ باغیان در دہلی

چاشتگاہِ دوشنبہ شانزدہم ماہِ روزہ و یازدہم مئی سال یکہزار و ہشت صد و پنجاہ
و ہفت ناگرفت در و دیوار بارہ و بارۂ دہلی بجنبید و آں جنبش زمیں را فرا گرفت۔
سخن در زمیں لرز (زلزلہ) نمی رود، در آں روزِ جہاں سوز، بخت برگشتہ و سرگشتۂ
چند از سپاہِ کینہ خواہِ میرٹ بشہر در آمدند۔ ہمہ بے آزرم و شور انگیز، و بخداوند
کُشی تشنۂ خونِ انگریز۔ دیدبانانِ دروازہ ہاے شہر کہ بُردن (علاوہ) از ہمگوہری
و ہم پیشگی نشگفت (عجب نیست) کہ از پیش ہم سوگند نیز باشند، ہم پاسِ نمک
و ہم پاسِ شہر گزاشتند و مہمانانِ ناخواندہ یا خواندہ را گرامی داشتند
آں سوارانِ سرگرانِ سُبک جلو (سبک عناں) و پیادگانِ تند خوے تیز دَو چوں درہا
باز و دربانان را مہمان نواز یافتند، دیوانہ وار ہر سو شتافتند، و ہر کرا از فرماندہاں
و ہر کجا آرامشگاہِ آں رہان یافتند، تا زار نکشتند و پاک نہ سوختند، رُوے ازاں سُوے
برنتافتند۔ مشتے گدایانِ گوشہ گیر از بخششِ انگریزی توشہ گیر کہ نان پارہ و دوغ
می خورند و در شہر دور از یکدگر پراگندہ جا بجا روزگار بسر می برند (یعنی رعایاے
شہر)، ہمہ نیز از نبرنا شناسندگان و از غوغاے دزدِ تیرہ شب ہراسندگان نہ پلارکے
در دست، و نہ خدنگے در شست، اگر راست پُرسی، ایں مردم بہر آبادیِ کوے
بُرزَن اند، نہ براے آنکہ بہ آہنگِ پیکار دامن بہ کمر زنند، با اینہمہ ازاں رُو کہ راہِ
آبِ تیز رَو بہ خاشاک نتواں بست، دست از چارہ کوتاہ دید، ہر یکے در سراے خویش
بماتم نشست یکے ازاں ماتم زدگاں منم کہ در خانۂ خویش بودم، چوں غریو و غوغا
شنودم، تا از پژوہش دم زدم۔ دراں مایہ درنگ کہ مژہ برہم زدم، آوازہ بخوں غلطیدنِ
صاحب اجنٹ بہادر و قلعہ دار در ارک (قلعہ) و دویدنِ سواراں و پیاپے رسیدنِ
پیادگان در راستہ بازار از ہر گوشہ و کنار، بلند گشت ہیچ مشتے خاکے نماند کہ از خونِ گل اندامان

ارغواں زار نشد، وہیچ کنج باغے نبود کہ از بے برگی ما نا بد خمۂ نوبہار نشد۔ ہاے!
آں جہانداران داد آموز، دانش اندوز، نکو خوے، نکو نام، و آه، ازاں خاتونانِ
پری چہرۂ نازک اندام، با رخے چوں ماه و تنے چوں سیم خام، و دریغ، آں
کودکانِ جہان نادیده کہ در شگفتہ روئی بر لالہ و گل می خندیدند و در خوش خرامی
بر کبک و تذرو آہو می گرفتند کہ ہمہ یکبار بگردابِ خوں فرو رفتند۔ اگر مرگ بربالین
ایں کشتگان بموید (بگرید)، خرد شد، و دریں سوگ سیاه پوشد، رواست، و اگر سپہر خاک
گردد و فرو ریزد، و زمین سراسیمہ چوں گرد از جا برخیزد، بجاست:

اے نوبہار! چوں تنِ بسمل بخوں بغلط — اے روزگار! چوں شبِ بے ماه تار شو
اے آفتاب! روے بہ سیلی کبود کن — اے ماہتاب! داغِ دلِ روزگار شو

بارے چوں آں روز تیره بشام رسید و گیتی تاریکتر گردید، سیہ درونانِ خیره کش
(بخیرگی کشنده)، ہم در شہر جا بجا رختِ تن آسانی انداختند، و ہم در ارک باغِ
خسروی را آخر اسپاں و نشیمنِ شاہی را خوابگاهِ خویش ساختند۔ رفتہ رفتہ از
شہرہاے دور دست آگہی رسید کہ شوریدگانِ ہر سپاه، در ہر فرود آمدن گاه (منزل)
خونِ سپہبداں ریختہ اند۔ گروہا گروه مردم را از سپاہی و کشاورز دل یکے گشت،
و ہمہ بے آنکہ باہم سخن رود، دور و نزدیک یکدست بر یک کار کمر بستند؛
و آنگاه چساں پُر زور کمرے و چگونہ استوار بستنی کہ جز بہ جنبشِ جوشِ خونے کہ از
کمر گذرد، کشاد نہ پذیرد۔ پنداری کہ ایں لشکرہاے بے مرد جنگجویانِ بے شمار را
جاروب وار کمر بندیکی ست۔ آرے رُفت و رُوبِ ہند بوم بداں ساں کہ آرامش
و آسایش اگر جویند باندازۂ پرِ کاہے گاہے نیابند۔ ہمچنیں جاروبِ گیتی آشوب
ہمیخواست۔ اینک ہزار لشکر نگری، ہمہ بے لشکر آرائے آراستہ، و یسا سپاه بینی
یکسرہ بے سپہدار بجنگ برخاستہ۔ توپ و گلولہ و ساچمہ (چھرّا) و بارود ہمہ از خانۂ

انگریز آورده، و با گنجینه داراں رُوئے بستیز آورده، آیینِ نبرد و ورزشِ پیکار ہمہ از انگریز آموختہ و رُخ بکینِ آموزگاراں افروختہ۔ دل ست، سنگ و آہن نیست، چرا نسوزد؟ چشم ست، رخنہ و روزن نیست، چوں نگرید؟ آرے ہم بداغِ مرگِ فرماندہاں باید سوخت، وہم بہ ویرانیِ ہندوستاں باید گریست۔ شہرہائے بےشہریار پُر از بندہ ہائے بے خداوند، چنانکہ باغہائے بے باغباں پُر از درختانِ نابرومند رہزن از گیرودار آزاد و بازارگان از تمغا، خانہا ویرانہا و کلبہا (دوکانہا) خوانِ یغما۔

از دیباچۂ ثانی درفشِ کاویانی

غالبِ خاکسار ہرزہ کار را از آسمان بر زمین فرستادند و فرمان دادند کہ دریں پیشہ پیشۂ کشاورزی (کاشتکاری) ورزد۔ و ایں فرازماں (فرماں) را بازماں (توقف) نپسندد۔ ناگزیر می بایست (ضرور تھا)، کمر بستن و زمیں خستن، اگاہ راندن و دانہ افشاندن۔ نادان (کشاورزی نکرد بلکہ)، بہوس در زمینِ غزل جاں کند و ازاں گہرہا کہ با خویش آورده بود، نیمہ دراں زمیں پراگند۔ ہمانا (گویا)، از ہر دانہ کہ کاشت بزاروانہ چشم داشت از مرواریدہ کہ در خاک نہاں کنند۔ نشنیدہ کہ ریشہ سر برزند، کاش جُو کاشتے، تا سُود برداشتے! دانست کہ ہمہ را خاک خورد (یعنی تلف شد) ناچار نیمۂ دیگر را پیشِ شاہانِ روزگار بُرد۔ دیدند و پسندیدند و نخریدند شبے با یکے از رازدانانِ پردہش (پُرسش)، رفت کہ در مبدأ فیاض بخل نیست، ابر بر باغ و راغ دشمن و دوست یکساں بارد، چراست کہ مردم چندے ناداروانندے (چندے) توانگرانند۔ گفت راست گفتی، تو قبعِ سرنوشت ہا یکے ست (یعنی یکسانست)، جداشناس (مابہ الامتیاز)، اگر ہست، جز ایں نیست کہ کارد بارگوہرے از ہر یک بر یک ورق، دوزد

سازِ جرگہ دگر دہے، از ہر کس بر یک صفحہ نوشتہ اند۔ آناں ورق از دفتر با خویش آوردند و براتِ روزی از ہر در کہ مقدر بود، بُردند۔ ایناں ازاں رو کہ انفکاکِ صفحہ از ورق صورت نہ بست، تہیدست آمدند، و تہی کیسہ زیستند۔ گفتم، از چیست کہ، در چار سوے دہر، ع

بختِ صلۂ مدح و قبولِ غزلم نیست

گفت، آں از نیست کہ برات (چٹھی یا چک) نیاوردۂ، و ایں ازانست کہ سخنہاے بلند داری، و بہ ناشناسا زباں (یعنی اجنبی زبان) حرف می زنی۔ گفتم، چہ کنم، تا از اندوہ باز رہم؟ گفت، شکیب وَرز و خوں گری، و آنچہ از شیخ علی حزیں شنیدۂ، می گوے ؎

کس زبانِ مرا نمی فہمد   بہ عزیزاں چہ التماس کنم

نشان دادنِ اغلاطِ برہانِ قاطع سپاس میخواست، نہ ستیزہ، در قلمروِ ہند کس نماندہ باشد کہ مرا بدیں نیکی بد نخواندہ باشد۔ یکے خنجر آورد کہ من قاطعِ قاطع برہانم، دگرے اخگر آورد کہ من محرقِ آنم۔ کیست، تا از من بداں جوانمرداں گوید کہ از دریدنِ دو ختنِ کاغذ جز فغان و دُخان چہ خیزد؟ بزہ مند (گناہگار) منم؛ اگر در آتش فگنند، وَر بہ تیغ دو نیم زنند، بہر دو گزند در خورستم (یعنی لائق ہستم)، و بہر دو سزا سزاوار...

سخندانِ راستی جوے را بایستہ آنکہ از ہر کتابِ فرہنگ عبارتِ جامع آں را بداں نگاہ تیز نگرد کہ از بس تیزی در جوہرِ لفظ فرو رود تا چگونگیِ پیوندِ الفاظ کہ انگیزش گاہِ معنی ست، آشکار شود۔ ہر گاہ آں را بہنجارِ اہلِ زبان نہ بیند، داند کہ در سوداے زباندانی جز زیاں نمی بیند۔

ؔ جو کتابیں قاطعِ برہان کے جواب میں لکھی گئی ہیں ان میں سے ایک کا نام قاطعِ قاطع اور ایک کا محرقِ قاطع رکھا گیا تھا۔

دگراں دانند و کارِ آناں؛ مرا نیز خردے و روانے دادہ اند۔ فراز آوردہ (پیش آوردہ) اندیشۂ بیگانگاں را چوں پذیرم؟ و از نیروے خردِ خداداد کار چرا نگیرم؟ ہستی بخش را سپاس کہ نیروِ فزاے دانشِ من دانشمند[1] کسی ست کہ اگر چنانکہ رازدان بود، رازگوے نیز بودے، ششمیں ساسان[2] بشمار آمدے:

زخویشاں بہ بیگانگی شاد مانم | نمانم بکس[3]، چوں بکس مے نمانم[4]
غریبم ولے روشناسِ عزیزاں | چنارِ سرافراز در بوستانم
گرفتم کہ از تخمِ افراسیابم | گرفتم کہ از نسلِ سلجوقیانم
دل و دستِ تیغ آزمائی ندارم | رہ و رسمِ کشورکشائی ندانم
بمیدانِ معنی خداوندِ رخشم | بمضمارِ پہلو زیاں، پہلوانم
ودوسی سال توقیعِ معنی نوشتم | سزد گر نویسند صاحبقرانم

قاطعِ برہان کہ صنعتِ نقشبندِ خیالِ من ست، نہ نامۂ اعمالِ من ست کہ در آں جہاں بمن خواہند سپرد؛ ہم دریں جہاں خواہد ماند۔ در دل فرود آمد کہ بمقامے چند کلامے چند بیفزایم و ایں مجموعہ را کہ قاطعِ برہان نام نہادہ ام، سپس درفشِ کاویانی خطاب دہم:

نازم بہ خرامِ کلک و طرزِ رقمش | ماناست ز تیزی بدمِ تیغ دمش
چوں اسمِ کتاب قاطعِ برہاں بود | گردید درفشِ کاویانی علمش

---

۱ مراد ازاں مولانا عبدالصمد استادِ میرزاست۔

۲ ساسان نام پسرِ بہمن بن اسفندیار بود کہ از بادشاہی بسیاحت و تحصیلِ حکمت و ریاضت پرداختہ و سر کس از اولادِ وے نیز بر طریقِ وے بودہ اند۔ ایں ہر چہار را ساسانِ اول و دوم و سوم و چہارم نامیدہ اند۔ من بعد پس از خسرو پرویز، ساسانِ پنجم بظہور آمدہ کہ دساتیر را از لغتِ ژند در زبانِ دری ترجمہ کردہ۔

۳ در صورت   ۴ در سیرت

حاشا کہ در ہیچ محل از عقیدۂ خویش رجوع کردہ باشم۔ سرودنِ سخنہاے ریزہ (متفرقہ) جز افزودنِ ہوش انگیزہ (سبب و باعث) ندارد۔ یاراں جفا کنند، و من بہ ازاے ہر جفا (بعوض ہر جفا)، وفا ورزم۔ ہمانا نکوئی و بہیِ یاراں خواہم و بس۔ بند نہند، پند دہم۔ داد دریغ دارند، اندرز دریغ ندارم۔ سنگ زنند، ثمر بارم۔

از تقریظات و دیباچہ ہاے

مرزا نے جو تقریظیں اور دیباچے اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابوں پر نثر میں لکھے ہیں، ان میں، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، شاعری کا عنصر نظم سے بمراتب غالب تر پایا جاتا ہے۔ ہر ایک معمولی بات کو تمثیل اور استعارے کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں فقروں اور ان کے اجزا میں ایک خاص قسم کا وزن اور تول اور اکثر سجع کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں۔ اکثر جگہ صفاتِ متوالیہ و متتابعہ ایراد کرتے ہیں اور صفاتِ مرکبہ جو نظم کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں، اکثر استعمال کرتے ہیں۔ پس سوا اس کے کہ یہ نثریں شعر کے اوزانِ مخصوص سے جن کو اس کی ماہیت میں کچھ دخل نہیں، معرا ہیں، ہر ایک اعتبار سے ان پر شعر کی پوری پوری تعریف صادق آتی ہے۔

چوں کہ یہ نثریں مرزا نے خاص کر اپنے عالی دماغ اور نکتہ سنج معاصرین کی ضیافتِ طبع کے لیے لکھی ہیں، اور ان میں اپنی نو آیین طرازی اور نادرہ سنجی کا جیسا کہ چاہیے، حق ادا کیا ہے۔ اس لیے جب تک کہ ان کے ایک ایک فقرے کی شرح نہ کی جائے، عام ناظرین ان سے کچھ لطف نہیں اٹھا سکتے، اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ کتاب کا حجم زیادہ بڑھ جائے گا، جس کی وجہ سے کتاب کا مطالعہ ناظرین پر شاق گزرے گا۔ لہٰذا ان نثروں میں سے صرف اس قدر انتخاب کیا جائے گا، جس سے مرزا کی ان جزیل و دل گرانمایہ نثروں کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔

اس غرض کے لیے ہم اوّل بطور مثال کے مختلف مقامات سے مختلف مضامین کے کچھ فقرے لکھ کر دکھاتے ہیں کہ مرزا کس طرح معمولی باتوں کو تمثیل اور استعارے کا لباس پہنا کر بلند منظر پر جلوہ گر کرتے ہیں۔ مثلاً کتاب "پنج آہنگ" کا دوسرا آہنگ جو مرزا نے اپنے نسبتی بھائی علی بخش خاں کی خاطر سے لکھا ہے اور جس میں اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف زبانِ فارسی کے متعلق کچھ ابتدائی قواعد اور ہدایتیں قلمبند کی ہیں، اس کے اول میں ایک تمہید لکھی ہے، جس میں طرح طرح سے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس پھیکے اور سیٹھے مضمون پر کچھ لکھنا میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔

وہاں ایک جگہ مضمونِ مذکور کی نسبت لکھتے ہیں: "زمینِ شور کہ چوں ذوقِ مے در طینتِ زاہد، ہیچ گلبن را در آنجا ریشہ در خاک نہ دَوَد، وخا کے نا استوار کہ ہر دیوار کہ دراں ریگستان بر کشند، پیش از سایۂ خود بخاک افتد۔"

فارسی دیوان کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو کہ دیوانِ مذکور اور اس کے نوادر افکار میں آورد اور تصنّع یا کسی استاد کی بلا واسطہ تعلیم اور ہدایت کو مطلق دخل نہیں ہے، اس طرح ادا کرتے ہیں: "بنا میزد (یعنی چشم بد دور) نخستیں نقابے ست از روے شاہد ہر صفت کردہ معنی بجنبش نسیم بر افتادہ، یعنی تنگِ کشاکشِ دست نا کشیدہ، باز پسیں چراغیست از گرمی چراغانِ نیم سوختہ پہلو رُخ با فروختن دادہ یعنی داغِ منّتِ خس نا دیدہ۔"

ایک جگہ اس مطلب کو کہ خدا تعالیٰ نے مجھے جیسا دماغ معنی خیز دیا تھا، ویسا ہی معنی کی قدر و قیمت پہچاننے اور اس کی بیان کرنے کا ملکہ بھی عنایت کیا، اس طرح بیان کرتے ہیں: "سخن آفرین خداے گیتی آراے راستایم کہ تا نہانخانۂ ضمیرم را از فراوانیِ رنگا رنگ معنی بہ لعل و گہر انباشت، بازوے ہم را تراز دے مرجان سنجی و خامہ ام را ہنگامۂ گہر پاشی ارزانی داشت۔"

اب ہم کچھ کچھ عبارتیں دیباچوں اور تقریظوں سے انتخاب کر کے ہدیۂ ناظرینِ باتمکین کرتے ہیں:

از دیباچۂ دیوانِ فارسی

دیوانِ فارسی کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو کہ لوگ مجھے اکتسابی علوم سے بے بہرہ سمجھ کر میرے حسنِ بیان پر تعجب اور میرے کمال سے انکار کرتے ہیں، اس طرح بیان کرتے ہیں:

"لاے خم میخانۂ سرمدی نسبت ناچشیدگان سگالند کہ ہیچمدانے را ایں مایہ سیرابیِ نطق از کجاست، غافل کہ نم رشحۂ یک فیض است کہ سبزہ را دمیدن، و نہال را سرکشیدن، و میوہ را رسیدن، و لب را زمزمہ آفریدن آموختند و بہ پرتو مہتابِ ازلی ہدایت شبگیر نکردگان اندیشند کہ تیرہ سرانجامے را ایں ہمہ روشنائیِ گفتار چراست، بیخبر کہ فرۂ تابش یک نور است کہ شمع را بشعلہ و قدح را بہ بادہ و گل را برنگ و دروں را بسخن برافروخت......

داغم از کوتہ نظرانِ تنگ چشم کہ دمیدنِ تازہ گل از گیاہ، و درخشیدنِ برق بشبہاے سیاہ شگفت ندارند، و جنبیدنِ زبانہاے گویا بہ سخن ہاے نغز دشخوار انگارند۔ غنچہ مشکیں نفس است و باد غالیہ ساے، و گل کشادہ روے و بلبل نوا سنج؛ زبان چہ گناہ کردہ است کہ سخن سراے نباشد۔ مہر جلوہ برتابد و ذرہ بیتابی و بحر روانی، و قطرہ آشنائی۔ دل را کہ گفتہ است کہ از شورش ستوہ آید۔ ہمانا بدانست ایں گروہ بادہ در خمخانۂ توفیق ہماں قدر بود کہ حریفانِ گزشتہ را تر دماغ ساختہ، حالیا بساطِ بزمِ سخن برچیدہ، و جام و سبو برسرہم شکستہ، و ازاں قلزم قلزم رادق نمے برجاے نماندہ پندارند۔ کاش، با نجمنے کہ مست در فردیں رَدہ (یعنی صفِ پائیں) بحلقۂ اوباش قدح می گیرم فرارسند، تا وارسند کہ مے فراواں ست و ساقی بیدریغ بخش، پیمانہا جرعہ

ریزست و لبہا العطش گوے۔ وللہ درّ من قال:

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشان ست — مے ومیخانہ با مُہر و نشان ست

آرے، صہبائے سخن بہ روزگارِ من از کہنگی تند و پُر زور ست، و شبِ اندیشہ را بہ فرّ دمیدنِ سپیدۂ سحری براتِ فراوانی نور ست۔ ہر آیینہ رفتگان سرخوش غنودہ اند، و من خرابستم؛ پیشینیاں چراغاں بودہ اند، و من آفتابستم۔

اس کے بعد ایک جگہ اپنے تمام فخر و مباہات پر افسوس کر کے اس طرح لکھتے ہیں:

انصاف بالائے طاعت ست، در ہوائے کہ بالِ بالا خوانی (یعنی خود ستائی) زدہ ام، و در ادائے کہ خود را شگرفی ستودہ ام، نیمہ ازاں شاہد بازی ست یعنی ہوا پرستی، و نیمۂ دیگر توانگر ستائی یعنی باد خوانی۔ بیداد بیں کہ ہر جا بشانہ خمے از زلفِ مرغول مُویاں کشودہ شود، بلا در من آویزد، تا دل بہ پیچاکِ آں شکن بندے؛ و خواری نگر کہ ہر گاہ از خود غافل و از خدا فارغے بر اورنگِ سروری کج نشیند، ہوسِ مرا برانگیزد، تا بہ پیشش بندہ وار راست ایستے۔ شادم از آزادی کہ لبا سخن بہ ہنجارِ عشق بازاں گزاردستم، و داغم از آزمندی کہ ورقے چند بکردارِ دنیا طلباں در مدحِ اہلِ جاہ سیاہ کردستم۔ دریغا کہ عمرِ یک سیر لختے بچارہ و چنگ سر آمد، و پارۂ بہ دروغ و دریغ رفتہ فرجامِ گراں خوابی برنخاست، و آشوبِ ہوسناکی فرو نشست۔

از خاتمۂ دیوانِ فارسی

خاتمۂ دیوانِ فارسی میں اس بات کا عُذر کہ دیوان کی تکمیل میں کیوں اس قدر دیر لگی کہ اکتالیس برس کی عمر میں اس کے چھپوانے کی نوبت پہنچی، اس طرح کرتے ہیں کہ فکر نہایت خود سر اور بلند پرواز تھی؛ اس کی روک تھام میں بہت سا وقت گذر گیا۔ اور اس مطلب کو اپنے طرزِ خاص میں یوں ادا کرتے ہیں:

ہان وہان رخشے بداں توسنی کہ عنانش مُوئے و مشاش بوئے برنتافتے

واز شموسی (سرکشی) گام بدرازی ننہادہ جز بہ پہنا نہ نشتافتے۔ از ترسندہ دلی عنانش کشیدہ، و بہ لابۂ آوازبوسہ اش آرمیدہ داشتمے۔ چوں پارۂ از راہ بدیں گونہ کہ بر شمردم، بُریدہ شد، و روز بلند گشت، ہم جوشِ تندیِ توسن فرو نشست، و ہم دست وپاے سوار از عنان و رکاب خستگی پذیر آمد۔ تابِ مہرِ نیمروز، مغز در سرِ سوار گداخت، و تفتگیِ ریگِ بیابان، نعل در پاے تکاور نرم کرد۔ رائض را دم و کرّہ را قدم بگداز آمد۔ ہم آں بہ آخر گرائید، و ہم ایں را بہ بستر نیاز آمد۔ توانائی بہ چارہ سگالی توسنی سر آمد، و در ہنگام گسستہ دمی خستگی روے آورد......کیست، تا از من پرسد؟ و اگر ناپرسیدہ گویم، در دلش فرود آید کہ دریں سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزشہا (یعنی جنگہا) روے دادہ؛ و پس از آنکہ کار بد انجار رسیدہ کہ ہمہ گر از کوتگی فرو ماند، بمیانجی گریِ توفیق بکدام قرارداد آشتی اتفاق افتادہ، خامۂ دیر جنبش بود و شوق زود گراے (جلد باز)؛ گفتار ہا از نہیبِ دورباشِ اندیشہ بدراز نلے فاصلہ دل و زبان خون شد، و اگر ناگہ از دل بہ زبان رسید؛ والا تبسیجی ہمت آں را بخامہ نہ سپرد۔ ہر چند منش (طبیعت) کہ یزدانی سروش ست، در سر آغاز نیز گزیدہ گوے و پسندیدہ جوے بود، اما بیشتر از فراخ روی (یعنی بسبب آزادروی) پے بہ جادہ نشناساں برداشتے، و کژیِ رفتارِ آناں را لغزشِ مستانہ انگاشتے۔ تا ہمدراں تکاپو پیش خراماں را بجستگی از روشِ ہمقدمی (یعنی لیاقتِ ہمراہیِ خویش) کہ در من یافتند، مہر بجنبید، و دل از آزرم (مروت) بدرد آمد۔ اندوہ آوارگیہاے من خوردند، و آموزگارانہ در من نگرستند۔ شیخ علی حزیں بخندۂ زیر لبی بیراہہ رویہاے مرا در نظرم جلوہ گر ساخت، و زہر نگاہِ طالب آملی و برق چشمِ عرفیِ شیرازی مادۂ آں ہرزہ جنبشہاے نارَوا در پاے رہ پیماے من بسوخت۔ ظہوری بسر گرمیِ گیرائیِ نفس (تاثیرِ کلام) حرزے ببازوے و نوشۂ بکمر بست، و نظیریِ لاابالی خرام بہنجارِ خاصۂ خودم بچالش (رفتار) آورد۔

از دیباچۂ دیوانِ تفتہ

دیوانِ تفتہ کے دیباچے کی تمہید میں ضعف و انحطاطِ قویٰ اور اپنے قلب ماہیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہاں! اے غالب تیرہ روزِ دژم اختر! کہ بدیں ہستی و کسائی (شخصیت کہ تراست) بداں مانی کہ دانی، در عالم فرضِ محال سپندے دیدہ ایم، بر آتش آرمیدہ۔ اللہ اللہ چہ مایہ جوشِ سوداست (یعنی غلبۂ مادۂ سودا) کہ ہر نفسے کہ می کشی، چوں خطے کہ از نقطہ بر آوردند، ہم رنگِ سویداست۔ آں قلمروِ اندیشہ کہ از روانیِ خامہ و روانیِ گفتار آب و ہوا داشت، دَے تہش را فرورِدین پرستار بود، و چاشتنگہش را نسیمِ سحری پیشکار۔ بدیں ناخوشی و نژندی ویراں چراست۔ سبزہ را چہ افتاد کہ بہ چمیدن دل از دستِ تماشائیاں نبرد، و غنچہ را چہ روے داد کہ بہ دمیدن پردۂ شکیبِ نظارگیاں نہ درّد:

آں اثرِ پردۂ سازت چہ شد	زمزمۂ خارہ گدازت چہ شد
آں زِجنوں پردہ کشائیت کو	ولولۂ سلسلہ خائیت کو
آں نفسِ نارکمندت کجاست	واں نگہِ جلوہ پسندت کجاست

گفتی (یعنی در جواب گفتہ) کہ سوزِ غم دُود از دل بر آورد، و گدازِ نفس آذر در زباں زد۔ بادلے کہ ہر آئینہ نگداختے و بازبانے کہ ہمانا نسوختے، عذرِ غمزدگی مسموع نیست۔ بیا تا ہمیں دلِ بدزہرۂ الحذر لولۓ را بہ سخن نہیم، و ہمیں زبانِ کژ نغمۂ ایں المقرسرائے را بہ گفتار آریم (یعنی طوعاً و کرہاً تقریظِ دیوانِ تفتہ بہ نگاریم)

زمن جوے در بدنکو زیستن	جگر خوردن و تازہ رُو زیستن
سمن چیدن و در رہ انداختن	دل افشردن و در چہ انداختن

(مراد از سمن چیدن و در رہ انداختن آنکہ بر ہمگناں اظہارِ خوشحالی می کنم و اندوہِ دردنی را کہ دل افشردن عبارت ازاں ست در چاہ می اندازم، تا بر ہیچ کس ظاہر نشود)

روان کردن از چشم ہموارہ خوں — بہ شورابہ شستن ز رخسارہ خوں
شگفتن ز داغے کہ بر دل ربود — نہفتن شرارے کہ در دل ربود

از تقریظِ تذکرۂ گلشنِ بیخار

ستایشِ سخن چشم بد دور، خمکدۂ سخن راشرابے ست پُر زور کہ زمین ازاں بلائے (یعنی بدمستی)، وسپہر ازاں بہ بوے آنچناں بہ رقص آید کہ اگر کعبہ را حجر الاسود از دیوار و مشتری را عمامہ از فرق فرود اُفتد، شگفت نہ نماید۔

انتخاب از مکاتبات

مرزا کی نثر کا سب سے بڑا حصہ ان کے مکاتبات و مراسلات ہیں، جن میں سے اکثر بہت صاف اور سلیس ہیں۔ اسی لیے ہم اس حصے میں سے بہ نسبت اور نثروں کے کسی قدر زیادہ انتخاب کریں گے اور جہاں تک ہو سکے گا، مشکل نقروں اور دقیق عبارتوں کے نقل کرنے سے احتراز کیا جائے گا، اور نیز جو امور مرزا کے خانگی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو بھی چھوڑ دیا جائے گا۔

مرزا علی بخش خان فیروزپور جھرکے میں ہیں، نواب احمد بخش خان کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کی جگہ شمس الدین خان مسند نشین ہوئے ہیں۔ مرزا نے علی بخش خان کو کلکتے پہنچ کر خط لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

میر فضل مولیٰ خان نام یارے داشتم، اورا ناگرفت (ناگاہ) در عرضِ راہ بہ مرشدآباد یافتم۔ در نوردِ گفتگو ہاے وپرس و جُو ہاے کہ رفت، از جامہ گذاشتنِ (یعنی از مردن) فخر الدولہ بہادر بمن خبر داد، و باز بہ کلکتہ مرزا افضل بیگ و دیگراں برگفتند۔ آوخ! کہ چراغِ روشنِ ایں دُودمان مُرد،

وشبستانِ آرزو با تیرہ و تار شد۔ از جانبِ شما اندیشناکم و دانم کہ آنچہ شمارا پیش آید، دلخواہ نباشد۔ ناکساں را روز بازار خواہد بود، و فرومایگاں را گرمیِ ہنگامہ۔ زود ا کہ انجمن از ہم پاشد، و پراگندۂ چند گرد آیند۔ دولت روے گرداند، و آسودگی برخیزد۔ زنہار، ہوشمندی را کار باید بست، و ہموارہ بخود نگران باید بود۔

ایک اور خط کو جو علی بخش خان کے نام لکھا ہے اس طرح شروع کرتے ہیں،

جانِ برادر! سخن را از فراوانی بر روے ہم افتادن ست، و گرہ در گرہ گردیدن۔ و من آن میخواہم کہ اندک گویم، و سود بسیار دہد، و شنوندہ آں را زود در یابد۔ و ایں بسیچ (قصد) روائی پذیر نیست مگر آنکہ گویندہ دراں کوشد کہ نبشتن از گفتن آں مایہ دور تر نہ رود کہ سرِ ایں ہر دو رشتہ باہمدگر نتواں تافت، و نقشِ یکے در آئینۂ دیگرے نتواں یافت۔ زمانے گوش بمن دارید و فرا رسید کہ چہ میگویم و ازیں گفتن چہ میخواہم، و شمارا در برابرِ آں چہ می باید کرد و اندازۂ آں بایست تا کجاست۔" اس کے بعد کچھ خانگی معاملات تحریر کیے ہیں۔

میر اعظم علی اکبر آبادی مدرسِ مدرسۂ اکبر آباد جو میرزا کے ہموطن ہیں، اور انھوں نے بیس برس کے بعد مرزا کو خط لکھا ہے اور خط نہ پہنچنے کی شکایت کی ہے، ان کے خط کا جواب اس طرح لکھتے ہیں:

امروز شرارۂ بدا غم زدہ اند — نشتر برگِ صبر و فرا غم زدہ اند
از کثرتِ شورِ عطسہ مغزم ریش ست — تا عطر چہ فتنہ بر دماغم زدہ اند

جنبشِ خامۂ عیسوی ہنگامۂ مطاعِ مکرّم مخدومِ اعظم را نازم کہ باجیاے ہوس ہاے مُردہ ساحتِ خاطر را عرصۂ محشر ساخت و بازارِ رستخیز گرم کرد۔ خار خار دیریں آرزوہا سر از دل بدر آورد۔ بیاد آمد کہ مرا ہم در گیتی وطنے، و از مہربانان انجمنے بودہ است۔ چوں نشترِ پرسش بمغزِ اندیشہ فرو بردہ اند یعنی

احوال پرسیدہ اند) خونچکانیِ نواہا تماشا کردنی ست۔ درازیِ زمانِ فراق کہ بگمانِ مخدوم شانزدہ سال است و بدانستِ نامہ نگار کم از بست سال نیست ، سر تیز کز لکے بودہ است کہ نقشِ آسایش از صفحۂ خاطر بداں سترده اند۔ آغازِ ورود بدہلی کہ دُردِ بادۂ غفلتے بہ قدح داشتم (یعنی بقیہ ہوا و ہوس در سر بود) ، لختے از عمر بہ پیمودنِ جادۂ کامرانی ہوس گذشت ، و بے راہہ خوابیدہ شد ، تا سراز مستی بگردید (یعنی بدمستی سے بھر گیا) واندراں بیخودی پائے مصطبہ پیما بہ گوے فرو رفت دگڑھے میں اتر گیا یعنی ایک ایسا صدمہ پہنچا کہ نتھنے ہرن ہو گئے) لاجرم درہم شکستہ سراپاے وگرداندوہ سر و رُوے ، برخاستم ۔ ہنگامۂ دیوانگی برادر یک طرف، و غوغاے وام خواہاں یک سُو، آشوبے پدید آمد کہ نفس راہِ لب ، ونگاہ روزنۂ چشم ، فراموش کرد ، وگیتی بدیں روشنی روشناں در نظر تیرہ و تار شد۔ بالبے از سخن دوختہ ، وچشمے از خویش فرو بستہ ، جہان جہان شکستگی و عالم عالم خستگی ، باخود گرفتم ، واز بیدادِ روزگار نالاں ، وسینہ بردم تیغ مالاں ، بکلکتہ رسیدم ۔ فرماندہان سر بزرگی دکو چکدلی (یعنی مہربانی وشفقت) کردند ، و دل را نیرو بخشیدند۔ آں ہمہ بخشایش کہ مشاہدہ رفت ، امیدِ کشایش آورد ، وذوقِ آوارگی وہواے بیاباں مرگی کہ مرا از دہلی بدر آوردہ بود ، بدل نماند۔ وہوسِ آتشکدہ ہاے یزد و میخانہ ہاے شیراز کہ دل را بسُوے خود میکشید ، و مرا بہ پارس میخواند ، از ضمیر بدرجست (یعنی بمشاہدۂ شہرِ کلکتہ جملہ ہوسہا از خاطر بدر رفت) ۔ دو سال درآں بقعہ مجاور بودم ۔ چوں گورنر جنرل آہنگِ ہندوستان کرد ، پیشاپیش دویدم ، و بہ دہلی رسیدم ۔ روزگار برگشت ، وکارِ ساختہ شدہ ، صورتِ تباہی گرفت ۔ اکنوں ششمیں سال ست کہ خانماں بباد دادہ ، و دل بر مرگِ ناگاہ نہادہ ،

بکنجے نشستہ ام، و در آمیزش بروے بیگانہ و آشنا بستہ۔"

"من اگر با اینہمہ رنج و اندوہ کہ پارۂ ازاں باز گفتم، در نگارشِ نامہ و سپارشِ پیام کاہل قلم و کوتاہ دم باشم، و بزرگانِ وطن را بیاد نیارم، در عالمِ انصاف بزہ مند نیستم۔ اما گر انما یگانِ جہانِ مہر و وفا کہ از دور افتادگان نپرسند و از مرگ و حیاتِ دوستاں باز نجویند، اگر گفتگو بمیان آید، و سمندِ شکوہ عنان بر عنان (یعنی بمقابلۂ یکدگر) تازد، گوے دعوئ چگونہ خواہند برد، و قطع نظر از حریفِ آب دندان (یعنی حریفِ مغلوب) کہ منم، خدائے توانا را چہ جواب خواہند داد:

کس از اہلِ وطن غمخوارِ من نیست   مرا در دہر، پنداری، وطن نیست"

مولوی نور الحسن نامی ایک نوجوان نے کلکتے سے مرزا کو خط لکھا ہے اور اس کے ساتھ ایک نثر کا مسودہ اصلاح کے لیے بھیجا ہے۔ اس کے جواب میں جو خط مرزا نے لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں:

پدید آمد کہ خاطرِ عاطر را بجانب نثر گرایشے، و ہنگامۂ ایں گفتار (یعنی نثر نگاری) را در آنجا (در کلکتہ) آرایشے ہست۔ بارے ہم دل بہ پسندیدہ شغلے نہادہ اید، و ہم اندریں فنِ گزیدہ روشے پیش گرفتہ اید۔ دم سردئ شما (یعنی کم شوقئ شما) بدانش آموزی آنچہ دیروز (یعنی در زمانۂ گذشتہ) بہ کلکتہ دیدہ ام، یاد میکنم۔ و خون گرمئ شما (یعنی سرگرئ شما) در خرد اندوزی آنچہ امروز می نگرم، خود را بدیں شادی کنم۔ ہمانا در اندیشہ نہالے بر رہگذر دارم، بداں زودی کہ ثمر از شاخ افتد، نخلے شدہ، و رُطب بار آوردہ۔ نے نے، بہ ہنگامۂ یوسفی در نظر دارم، بداں خوبی کہ دل از فرشتہ رباید، از بندِ حجاب بدر آمدہ، و ہر ہفت کردہ خواستہ آید کہ مسودۂ نثر در ہر ماہ بمن فرستید، و من آں را نگرستہ و نشست

ہر کرشمہ وانگیزِ ہر بذلہ را بابایستگی آراستہ بشما فرستم۔ صاحبِ من! مگر ندانستہ آید کہ گفتار جز بگفتار سرہ نگردد، و سخن جز بہ سخن شناختہ نشود۔ ہرچند ارادتِ شما ذریعۂ سعادتِ من و خرسندیِ شما موجبِ رضامندیِ من ست، لیکن تحریر درمیان نگنجد، و بہ میانجی گریِ خامہ کار برنیاید۔ آرے نگارش یکدست ست وگفتار لخت لخت۔ ستردنِ یک لفظ ازمیانہ و آوردنِ لفظِ دیگر بجاے آں برنشانہ دانا شناسد کہ چہ مایہ گفتگو و چہ قدر پرس و جو دارد۔ و حقِ ایں پرسش نتواں گزارد، مگر بہمزبانی۔ دریں نزدیکی یکے از برادراں کہ در برادراں از وے عزیزترے نیست، سخنہاے پراگندۂ مراکہ عبارت از نثر ست، گرد آوردہ وصورتِ سفینہ دادہ است۔ زیں پس آں مجموعۂ پریشانی راپیشِ شما می فرستم، تا دست مایہ سگالش در سخن و باز نمایندۂ اندازۂ نکوئیِ من تواند بود۔

نواب مصطفیٰ خان مرحوم نے (جب کہ مرزا سے نیا نیا تعارف ہوا ہے) مرزا کو خط لکھا ہے اور اس میں ان کی شاعری اور نکتہ سنجی کی بہت تعریف کی ہے؛ اپنے نتائجِ افکار میں سے کچھ ان کو بھیجا ہے اور ان سے تازہ غزلوں کی جو حال میں لکھی ہوں، درخواست کی ہے۔ مرزا نے اس کے جواب میں جو ایک طولانی خط لکھا ہے، اس میں ایک لمبی تمہید کے بعد لکھتے ہیں:

"تا دکانم درکشادہ بود، و رنگ رنگ متاعِ سخن بروے ہم نہادہ، کس از مشتریاں حلقہ بر در نزد، و سوداے خریداری از ہیچ دل سر برنزد۔ چوں دکان را کالا، و زیان را حرفہاے جگر آلا (یعنی آلودہ بخونِ جگر) نماند، روزگار گرانمایہ خریدارے (یعنی نواب مصطفیٰ خان) پدید آورد کہ نقدِ رائجِ سخنِ خود را بہ بہاے گفتارِ ناسرۂ من می دہد و گوہر را بہ پایۂ بیعانگیِ خزف می نہد ....

ہان و ہان، اے خریدارِ دکانِ بے رونق! از فراوانیِ مسرتِ ورودِ مسعودِ

ہمایوں نامہ چہ گویم کہ مرا، یا آنکہ نکوئی خواہِ خویشم، بر من بہ رشک آورد۔ حوصلہ مرا کہ فرسودۂ غمہائے دہرم، گنجائی ایں مایہ شادی کو؟ و اندیشۂ مرا کہ دل شکستۂ دور باشِ یارانم، فرجامِ پذیرائی ایں ہمہ قبول کجا؟ روزگار را از آزارِ خویش چگونہ پشیمان گیرے کہ اینچنیں شادی را بخود در پذیرے، و دوستان را تا کجا قدر ناشناس پندارے کہ از شما ایں قدر ستایش در بارۂ خویش باور دارے۔ حقّا کہ آسان ست ستودہ شدن بہ زبانِ شیوہ بیاناں (یعنی فصحا)، و دشوارتر از آنست اندازہ نمائی باندازہ داناں۔"

"قبلہ مزدِ چہل سالہ جگر کاوی آنست کہ فراہم آوردم، و بر فرقِ فرزنداں سائے افشاندم (یعنی مجموعۂ نظم فارسی)، اکنوں آبم بداں روانی و آتشم بداں گرمی نیست۔ گویی پس از سختنِ آں گنج گنجداں رفتہ، و از سخن ہرچہ ازل آوردِ من بود، گفتہ شد۔"

نواب مصطفیٰ خان مرحوم نے تذکرۂ گلشنِ بیخار کا مسودہ مرزا کے مطالعے کے لیے بھیجا ہے۔ اس کو دیکھ کر مرزا صاحب نے نواب صاحب کو یہ خط لکھا ہے:

"من کہ زبانم در ستایش بیقرار است و اندیشہ در سگالش (مشورہ) گستاخ، امید کہ دراں پایہ بیزمرۂ خوشامد گویاں شمردہ نشوم۔ و بدیں مایہ جرأت بزہ مند نگردم۔ بنامیزد (چشم بد دور)، تذکرہ ترتیب یافتہ و مجموعہ فراہم آمدہ کہ پیش طاقِ بلند نامی رانقش و نگار است و نہالِ نکو سرانجامی را برگ و بار۔ رہروِ نظر چوں بہ بیدائے کنار ناپیدائے ذوقِ سخن گام تماشا بردارد، توشہ بہ ازیں بہ کمر نتواند بست۔ خضر باں ہمہ جگر تشنگی کہ سکندر داشت، لبش بر شحۂ آبے تر نتوانست کرد و آں آب از دریا بخشیدن بود۔ شما گردہے را از دور و نزدیک بہ سخن زندگانیِ جاوید بخشیدید، و ایں

لختے از عمر بکارِ دیگراں کردن ست۔ جاوداں زندہ باشید کہ سخن گویاں از شما زندۂ جاوید شدند۔ و ہمگناں را بہ نکوئی نام برآمد۔ بارے گہر سُفتنِ خامۂ گوہریں نہ گشتنِ نامہ در ردیفِ الف بہ نگارشِ اشعارِ پرویں نثار حضرت آزردہ[1] از چہ رُوست؟ ہر چند ذکرِ خدامِ بر جبیں مقام در جریدۂ ایں فن نہ سزاوارِ شانِ فضیلت باشد، لیکن اگر بمقتضائے فرطِ محبت جرأتے بکار می رفت، گناہے نہ بود و در تلافیِ آں بہ پوزشِ[2] نیاز نمی افتاد۔"

حکیم احسن اللہ خان مرحوم نے مرزا سے جب کہ وہ کلکتے میں مقیم ہیں، خواہش کی ہے کہ اگر آپ نے اپنی کچھ نثریں جمع کی ہوں تو بھیج دیجیے۔ اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں:

"درد مند نواز! نسیمِ ورودِ مشکیں رقم نامہ غنچۂ ایں راز را پردہ کشائے و شمیم ایں نوید را غالیہ سائے آمد کہ روزگار بہ گزلکِ مدِّ طولِ زمانِ فراق نقشِ بے اعتباری ہائے من از صفحۂ خاطرِ احباب نہ ستردہ، و ترکتازِ صرصرِ بیدادِ جدائی خاکساری ہائے مرا از یادِ عزیزاں نبردہ است۔

"در معرضِ طلبِ نثر فرماندہ تر ازاں میزبانِ بے دستگاہم کہ ناگرفت (اچانک)، مہمانے عزیزش از راہِ دور در رسد، و بیچارہ بسا گردِ سراپائے سرمایۂ خویشتن نگردد۔ تا شوربائے دُود پختے و نانِ کشکینے (یعنی نانِ جویں) فراز آرد۔ من و ایمانِ من کہ بگرد آوردنِ نثر پراگندہ نپرداختہ

---

۱ اوّل مسودے میں مفتی صدرالدین خان مرحوم متخلص بہ آزردہ کا تذکرہ نہیں کیا گیا تھا۔ مگر مرزا نے جب یہ خط لکھا، تو نواب صاحب نے ان کا تذکرہ بھی درج کر دیا۔

۲ عذر ۳ حاجت

و خود را دریں کشاکش نیند اختہ ام۔ چہ پیداست کہ فرد ریختۂ کلکِ ایں کس (یعنی من)، نقشے ست نزشند (یعنی زشت)، یا رقمی ست فرہمند (یعنی خوب).
در صورتِ اوّل چہ لازم ست، خود را بہ ہیچ فروختن و وبالِ نظارۂ آیندگان بہ سلم خزیدن؛ و در شقِ ثانی اندیشہ می سنجد کہ رفتگان چہ بُردہ اند و گذشتگان چہ یافتہ کہ مارا از رُوے آں وایہ (یعنی دریوزہ) بیتاب دارد. انصاف بالاے طاعت ست۔ بدعوی گاہے کہ توانائیِ قتیل را بفرو ہیدگیِ فرہنگ (یعنی بہ پسندیدگیِ روش)، مسلّم داشتہ و لواے نور العین واقف بشیوائیِ شیوہ (یعنی بخوبیِ طرز) برافراشتہ باشند باکہ باید گفت کہ نتائجِ طبعِ ما کجائی است و مارا چہ لذّت دریں جگر خائی ست۔ سطرے چند بیباجگیِ دیوانِ ریختہ کسوتِ حرف و رقم پوشیدہ، و دودِ سوداے کہ بہ آرایشِ سفینۂ موسوم بہ گلِ رعنا از سویدا جوشیدہ است، ارمغان فرستم و از شرمِ تنگ مایگی آب میگردم۔ والسّلام

شیخ امام بخش ناسخ نے اپنا دوسرا دیوان میر موسیٰ جان کے ہاتھ مرزا کو بھیجا ہے، اس کی رسید اس طرح لکھتے ہیں:

دریں ہنگام کہ فرو ماندگی از اندازہ گذشتہ و دل بہ افسردگی خوی گرفتہ است، ندانم چہ می نگارم و چہ می نگرم کہ دریں نگریستن نگہ از ناز بدیدہ درنمی گنجد، و دریں نگارش خامہ از شادی درمُبنان (سرانگشت) می رقصد۔ بخت را بہ رسائی ستائیم و پندارم کہ بطورِ معنی رسیدہ ام۔ خود را بگراں مایگی آفریں گوئیم و انگارم کہ موسیٰ را با یدِ بیضا دیدہ ام۔ اگر مخدوم مرا بگرفتنِ عیارِ ایں دعوی جبرتے روے دہد، و ایں مایہ بالا خوانی و خودستائی از من عجب آید، گوئیم، ہاں انصاف، سخن بکنایہ می سرائیم

نہ بگزاف۔ موسیٰ اشارہ بہ سیدی مکرمی میر موسیٰ جان ست؛ و ید بیضا عبارت از دیوان فروغانی عنوان۔

"زہے دیوان کہ مدادش از دودۂ چراغِ طور ست، و غلافش از دیبائے حلّۂ حور۔ قلزمِ معنی را سفینہ است، و جواہرِ مضمون را گنجینہ ...... سبحان اللہ سخن بہ روزگارِ مخدوم بہ پایۂ بلند رسید، و اُردو را رونقِ دیگر پدید آمد۔ اینکہ نارسیدنِ نامۂ من بخاطرِ عاطر جائے گرفت، و شکوۂ آں بہ زبانِ قلم رفت، مرا آبرو افزود۔ وارزش مرا در نظرم جلوہ گر ساخت۔ خوشا من کہ دراں چشم و دلم جائے باشد، و چوں نامۂ من نہ رسد بآرزو ارزد۔ گردِ سرِ ایں نوازش گردم و بریں پرسشِ جاں برافشانم ...."

مولانا فضل حق مرحوم کے مکان کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو بذریعۂ خط موسومہ لالہ ہیرالال کے معلوم ہوئی ہے، اس پر مولانا ممدوح کو اس طرح لکھتے ہیں:

"قبلہ و کعبہ! اگر ایں نہ بودے کہ لالہ ہیرالال را ہوائے دیدنِ عنقا درسر، و ناگاہ شامگاہے بہ نشیمنِ تنہائیِ من گذر افتادے، آں در گرفتنِ آتش گرداگردِ والا کاشانہ و سوختنِ خانہ و رختِ ہمسایگاں از ہر کرانہ و نہ رسیدنِ آسیبے بہ ملازمان دراں میانہ، از کجا شنودمے، و اگر نہ شنودمے ہر آئینہ ہم حقِ دوستانۂ پرسش کہ شیوۂ غم خواری و اندوہ ربائی است، ناگزاردہ ماندے۔ و ہم ایزدی نیایش کہ لازمۂ حق شناسی و سپاس گزاری است، بتقدیم نرسیدے۔ ہاں! اے وفا دشمن! بیگانگاں (چوں لالہ ہیرالال) کامیاب پیام و نامہ، و آشنایاں جگر تشنۂ رشحۂ خامہ:

وائے بر من کہ رقیب از تو بہ من بنماید ۔۔۔ نامۂ واشدۂ، مہر بہ عنواں زدۂ

"ہمانا آں سوزندۂ آذر سرگرمیِ شوق از من فراگرفتہ بود کہ بیتابانہ گردِ سرگردید، واندراں اُشتلم (شدّت)، زبانہ وشرارہ در خویشتن نگہداشت۔ ہیہات، من کجا وایں ہمہ دعویِٰ بلند از کجا! خودنمائیا ے گمانِ تاثیر بیہودہ فاست کہ مرا بدیں رنگ ہرزہ لاے دیافہ سراے دارد، ورنہ آنراکہ از شعلۂ آہِ جگرسوختگاں دامن نہ سوزد، عجب نیست اگر آتش افروختہ پیرامن نہ سوزد۔ شکوہ پیشکش، وپیغارہ (طعنہ) برطرفؔ، خداے توانا را شکر گویم کہ بلاے بے زینہار از بندگانِ خویش بگرداند، وتا بے بصراں را دیدہ و دیدہ وراں را سرمہ بدست افتد۔ کرشمۂ نیروے جبریلؑ و معجزۂ آسودگیِ خلیل را در نظرہا تازہ کرد ..... اگر دانستے کہ پیشِ خود شرمساری نخواہم کشید، ومرا اندریں محال طلبی برمن زبانِ طعنہ دراز نخواہد شد، ازاں مخدومِ بے عنایت پاسخ ایں نامہ وتفصیلِ ایں ہنگامہ درخواستمے وپُرسیدمے کہ دراں ہنگام کہ آتش زبانہ زد، ونگہ بسراغِ تیرگی دُودے وتابش نمودے فرارسید، شما چہ می کردید؟ ونورِ چشمِ مردمی و فرزانگی مولوی عبدالحق کجا بود؟ وپس از آنکہ رستخیز در ہمسایہ آشکار شد، وہَزاہز در انجمن افتاد، سراسیمگیِ درونی پرستاراں و بیتابیِ برونی ہواداراں چہ قیامت آورد؟ واینہمہ آشوب چہ مایہ دیر کشید؟ وفرجام کار کہ مژدۂ ایمنی دادند۔ برکارخانۂ دواب وبنہ وبارِ کہاراں (یعنی اسبابِ ایشاں) کہ اینہا را جُز بہ اطرافِ کاشانۂ محل نیست، وبیشتر ازینہا طعمۂ آتش بلکہ افروزینۂ (ایندھن) آتش ست، چہ گذشت؟ لیکن چوں ارزشِ التفات

ؔ برطرف

از من سلب کردہ، و مرا نیک در دل فرود آوردہ اند کہ حالیاں دراں گوشۂ خاطرم جائے نماندہ۔ ہرچہ گفتہ ام بطریقِ آرزو ست، نہ بہ سبیلِ سوال۔ والسّلام۔"

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے خط کا جواب جس میں شوقِ ملاقات اور غزلِ تازہ کی خواہش ظاہر کی ہے، اس کے اوّل اور آخر کے فقرے یہ ہیں:

"سحرگاہے کہ دلم از دردِ شانہ چنانکہ مومنؔ[1] ہر پیشہ از رنج ہمسایہ در آزار باشد، بیقرار بود، و دستم از اشتلمِ بیتابیِ دل رعشہ دار؛ فرخندہ سروشے از در درآمد، و سپردنِ بہار سامان نامہ گل بہ جیب تمنا ریخت۔ ہرچند نامہ سیاد مسِ امید را کیمیا، و دیدۂ جاں را توتیا آورد، تارکِ اقبال را افسر، و پیکرِ آرزو را زیور بخشید، لیکن از آنجا کہ آں قدسی مفاوضہ از شعر و غزل، چوں نامۂ اعمالِ زاہد از ذکرِ مے و شاہد سادہ بود، دلِ سودا زدہ بداں نیاسود، و خمارم بداں یکدو جرعۂ صہبا نشکست۔ گفتم ہےہے، نہ مژدۂ دیدارے کہ دل بہ نشاطِ آں تواں بستن، و نہ کرشمۂ غزلے کہ لب بہ زمزمۂ آں تواں کشودن۔۔۔۔۔

امید کہ ازیں بعد زود نہ دیر، بانشای غزل شادم فرمایند، و نوید رُو بکوتاہی نہادنِ روزِ فراق کہ اندریں موسم کہ خسروِ انجم بہ اسدؔ[2] جائے وارد و عجب نیست بفرستند۔ دولت و اقبال روز افزوں باد۔"

---

۱ دل کو مومن اور شانہ کو ہمسایہ سے تشبیہ دی ہے۔

۲ یہ خط مرزا نے اس وقت لکھا ہے جب کہ آفتاب بُرجِ اسد میں تھا۔ چونکہ اسد مرزا کا تخلص اور ان کے نام کا جزو ہے، اس لیے آفتاب کے بُرجِ اسد میں ہونے سے یہ شگون لیا ہے کہ ایسے وقت میں آپ کا مجھ سے ملنا کچھ دور نہیں ہے۔

جوابِ نامۂ شیخ امیراللہ سرور تخلص:

"رسیدنِ دلنواز نامہ دل را تنومند و شاخِ آرزو را برومند ساخت.
گلہ از نارسیدنِ پاسخ نامہ ہاے خویش می کنید واز خدا شرم ندارید۔ من خود
از جانبِ شما نگرانی داشتم کہ کجائید؟ و چہ در سردارید؟ بارے پردہ
از روے کارِ شما برگرفتم، و دانستم کہ یک چندمرا فراموش کردہ بودید
ناگاہ ورودِ جناب مولانا تراب علی بداں بقعہ افتاد۔ شنیدید کہ فلانی
(یعنی غالب) از سخت جانی ہنوز زندہ است، ہر کہن بجنبید؛ خواستید کہ بنامہ
یاد آورید۔ از فراموشی روزگارِ گذشتہ اندیشہ کردید، لاجرم دروغے چند برہم
بافتید وآں را دیباے دیباچۂ نامہ ساختید۔ از حالِ من پرسیداید۔ چہ گویم
کہ بگفتن نیرزد۔ چنانکہ گفتہ اند:

شکستہ دل تراز اں ساغرِ بلورینم   کہ درمیانۂ خارکنی زدور رہا

خیرہ سرو آشفتہ راے، نہ زبانِ سخن سراے، و نہ دل از سراسیمگی برجاے۔
چہار سال می گزرد کہ مقدمۂ من با جلاسِ کونسل در پیش ست، و دلم از
تفرقۂ بیم وامید ریش۔ حکمے کہ قطعِ خصومت تواند کرد، برنیامدہ، وہنگام
بہ پایاں رسیدنِ تیرہ شبِ ناامیدی در نیامدہ۔ حالیا براں سرم کہ چوں
جزوِ اعظمِ کونسل اشرف الامرا لارڈ ولیم کونڈس بنٹنک بہادر بدیں دیار
درآید، بدامنش درآویزم و داد خواہم، و استدعاے صدورِ حکمِ اخیر کنم.
گروہے برآنند کہ نوابِ عالی جناب بہ دہلی نخواہد آمد، وہم ازاں رہگذر ہا
بہ اجمیر خواہد رفت۔ اگر ہمچنین ست بداِ من وروزگارِ من، وآدخ از دوریِ
راہ و درازیِ کارِ من۔

"خواستہ آید کہ نتائجِ طبعِ والاے شما بنگرم و از ترادیدہ ہاے کام د

زبانِ خود بشما ارمغانی فرستم ۔ فرصتِ آں کجا ؟ و دماغ ایں کو ؟ آمد آمدِ نواب گورنر، و دریوزۂ اخبار از ہر در، ترتیبِ افرادِ مقدمہ، و تمہیدِ نگارشِ حال، سنجیدنِ اندیشہ ہاے رنگا رنگ ، و سگالیدنِ اندازۂ بیان، آں مایہ دستیاری و غمخواری از کسے چشم نہ دارم کہ چوں ورقے انشا کردہ باشم، نقلِ آں تواند بر داشت، یا چوں دفترے از بہرِ نگریستن پریشاں کنم، آں اوراقِ پراگندہ را فراہم تواند کرد۔ بہر رنگ چندروز دگر معاف دارید و تا زمانیکہ بمن پیوندید، گاہ گاہ بہ نامہ زنگ زداے آیینہ وداد باشد۔"

مولوی سراج الدین احمد لکھنوی جو کلکتے میں کسی عمدہ خدمت پر ممتاز ہیں اور مرزا نے نہایت سچے اور گاڑھے دوست ہیں، ان کو نواب امین الدین خاں مرحوم کے باب میں جب کہ وہ رئیسِ فیروز پور جھرکہ کے خلاف اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے کلکتے گئے ہیں، اس طرح لکھتے ہیں :

"مخدومِ غالب ! اگر نہ اندوہِ سترگ بند بر دلم نہادہ بودے، من دانم و دل کہ در شکوہ چہ روش ہا ایجاد و در گلہ چہ عربدہ ہا بنیاد کردمے صرفۂ شما (یعنی سودِ شما) در ناکامیِ من ست (جس کے سبب سے شکوہ کرنے کی فرصت نہیں ہے) ورنہ اگر تاب و تواں داشتمے، آں قدر با شما در آویختمے کہ شما را دامن و گریبان بہ زیاں رفتے، و مرا سر درد شکستے ۔ آخر از خدا بترسید، واز روے داد بسنجید کہ کارِ من و شما بداں رسد کہ روز ہا بگذرد و بہ نامہ یاد نگردم ۔ گفتم (یعنی میں اوپر کہہ چکا ہوں) کہ در بندِ گزارشِ اندوہے تازہ ام شکوہ کجا بخاطرِ ناشاد می رسد ۔ اگر چہ اندریں ورق گنجائیِ ایں دو سطر نیز نہ بود، لیکن اندیشہ بداں پیچید کہ مبادا دوستِ ادا نشناسِ من مرا از خود خرسند داند و بدیں گمان از تلافی فارغ باشد و من زیاں زدۂ جاوید

گسستہ امید باشم

"بالجملہ دریں نامہ نگاری مدعاے اصلی بدیں رنگ ست کہ برادر صاحب مشفق نواب امین الدین احمد خان بہادر ابن فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ راہماں موجِ بلا کہ زورقم شکستہ بود (یعنی تعدیِ رئیسِ فیروز پور) خانہ بسیلابِ فنا داد۔ خونِ وفایم بگردن کہ دریں سفر از ہمپائیش باز ماندم۔ واماندگی و بیچارگیِ من از ینجا تواں سنجید کہ دندان بر جگر نہم، و امین الدین احمد خان را در سفر تنہا گزارم۔ اگر قاضیِ محبت بدیں جرم بر نطعم نشاند، و بہ تیغ بدریغ خونم ریزد، سزاوارم۔ و لطف درین ست کہ ہر چند دریں باب بگفتار گرایم، و ہنگامہ پوزش آرایم، شرمساری بیشتر گردد و خجلت افزاید۔ مگر سراج الدین احمد بہ تلافی برخیزد، تا از گرانیِ تشویر (شرمندگی) سبکدوش گردم، و گردِ خجلت از چہرہ برافشانم، یعنی کمر بہ غمخواری و رہرو نوازی استوار بندید، و خود را دوستِ دیرینۂ امین الدین خان دانستہ آں چناں چارہ سازی و سگالش گری بجا آرید کہ ایں دردمندِ دور از خانماں (یعنی امین الدین خان) اسد اللہ روسیاہ را فراموش کند، و شما را بجای اُو داند۔ و نیز بہ برادرِ والاقدر گفتہ شدہ است کہ چوں بہ کلکتہ رسد و شما را دریابد، داند کہ اسد اللہ پیش از و بہ کلکتہ رسیدہ است۔ قطع نظر ازیں مدارج کہ برشمردم، آخر خدائے ہست و دادے ہست! افسانۂ ناکامی و ستم کشیِ ایں فروغِ ناصیۂ سعادت یعنی امین الدین احمد خان خارہ را دل بگدازد، و آہن را آب گرداند۔"

دوسرا خط مولوی سراج الدین احمد کے نام اس طرح شروع کرتے ہیں:

"گوہر آگیں نامۂ دلنواز پس از روزگارے دراز رسید و دیدہ و دل را

فروغ و فراغ بخشید۔ نارسیدنِ نامۂ مرا بافسردگی شوقم حمل کردید، چرا برگِ
من حمل نہ کردید، تا از اداشناسی ہاے شما خرسند بودمے و شمارا اہلِ دل
و دانشور شمردمے۔ من و ایمانِ من کہ ریشۂ مہرِ شما بہ مغزِ دل و دیدہ و
محبتِ شما با جان در آمیختہ۔ تا زندہ ام، بندہ ام۔ وفا آیینِ من ست،
ومودتِ دینِ من ست۔ اگر در نگارشِ نامہ درنگے روے دہد، بر فراموشی
محمول نہ شود۔ درد ہا در دل، و ہنگامہ ہا در نظر، و تفرقہ ہا در خاطر، و سودا ہا
در سر۔ چہ گویم چہ می کنم، و روز و شب چگونہ بسر می برم"

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو استرلنگ صاحب
فارن سکریٹری گورنمنٹ کی کی وفات پر اس طرح لکھتے ہیں:

"عمرِ من و جانِ من! پس از رسیدنِ گرامی نامہ در بندِ آں بودم کہ
پاسخ گزار شوم و ماجراے خود شرح دہم۔ ناگہاں دی کہ دوشنبہ پانزدہم
ذی الحجہ بود، آوازہ در افتاد کہ مجموعۂ مکارمِ اخلاق راشیرازۂ وجود از
ہم گسیخت؛ شمعِ ایوانِ سروری مُرد، و نہالِ باغِ آگہی را برگ و بار فرو ریخت
دستگیرِ درماندگاں را دست از کار رفت، و گرہ کشاے بستہ کاراں را نے
بناخن شکست۔ خاکم بدہن، چگونہ گویم؟ و اگر من نہ گویم کیست کہ نمیداند کہ
مسٹر اندرو استرلنگ مُرد، و از گیتی جز نامِ نیک با خود نبرد۔ کاش، روے
گداختہ (پگھلی ہوئی کانسی) برروزنہ گوشم ریختندے، تا نہ شنودمے کہ چہ شد۔
اکنوں امیدِ غمخواری از کہ باید م داشت، و دل را بخیالِ گردشِ چشمِ کہ تسکین
داد۔ رپوٹے کہ فرانسس ہاکنس بہادر خصوصِ داد خواہیِ من بہ صدر فرستادہ
است چہ گویم کہ چہ امید کاہ و اندوہ فزاے بودہ است۔ بر کارسازیِ آں
چابک خرام بیداے فنا (یعنی استرلنگ) داشتم۔ اکنوں از شش سو فلک

بکامِ دشمن ست۔ زینہار در پاسخ ایں نامہ درنگ روا مدارید، و بنویسید کہ آں والا گہر را چہ رُو دے داد و آں گلبنِ روضۂ مردمی را کدام تند باد از پا فگند، و پس از وَے سرانجامِ دفترکدہ چہ شد و جالش کہ گرفت۔ اللہ بس ماسوئی ہوس۔"

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اپنے ایک کلکتے کے دوست مرزا احمد بیگ کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں:

"والا نامہ رسید، و نویدِ فراقِ دائمیِ مرزا احمد رسانید۔ چہ مایہ سنگین دل و سخت جانم کہ نامہ در تعزیتِ دوست انشا می کنم، و اجزائے وجودم از ہم نمی ریزد۔ می گفت کہ بدہلی می آیم۔ وعدہ فراموشِ بیمروت راہ گرداند، و ناقہ بسر منزلِ دیگر راند۔ گرفتم کہ خاطرِ دوستاں عزیز نداشت؛ چرا بحالِ خردسالانِ خود نپرداخت و سایہ از سرِ شاں باز گرفت۔ وائے بے یاریِ یارانِ وَے، و دریغا بے پدریِ پسرانِ وے۔ ہر چند از مرگ نتواں نالید، و گسستنِ تار و پودِ پندارِ ہستی را چارہ نتواں کرد، لیکن انصاف بالائے طاعت است، ہنوز ہنگامِ مردنِ مرزا احمد نہ بود۔ چرا آں قدر صبر نہ کرد کہ بہ کلکتہ رسیدمے، و رُوے نظارہ فروزش دگر بارہ دیدمے! چرا آں مایہ درنگ نہ ورزید کہ حامد علی جواں گشتے، و کارہا بہ اندازۂ دانشِ وَے رواں گشتے! حیف کہ مہین پسرش خُردسال ست و باشد کہ بہ حقیقتِ سرمایۂ پدر دانا و بگرد آوردنِ زرہائے پراگندہ توانا نباشد۔ و باشد کہ چوں آں سرمایہ بہ چنگ آرد، بباد دہد، و بر فرودستانِ خود ستم کند و کہیں برادراں را ناکام گزارد۔ ہرآینہ دریں حال امینے باید ہوشمند و حق شناس کہ گرد چارہ برآید و غمخواریِ بے پدر ماندگاں نماید۔ للہ دَرُّ مَن قال:

مرا باشد از دردِ طفلاں خبر — کہ در طفلی از سر برفتستم پدر
واللہ کہ تیمارِ آں بیچارگاں عینِ فرض و فرضِ عین ست ہم بر شما و ہم بر مرزا ابو القاسم خان۔ بیکسی ایں جماعہ در نظر باید داشت، و غافل نباید بود۔ انّ اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔"

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد سے دوستانہ شکایت اس طرح کرتے ہیں:

"زینہار، صد زینہار، اے مولوی سراج الدین! بترس از خدائے جہان آفریں کہ چون قیامت قائم گردد، و آفریدگار بنشیند، من گریان و مُویہ کنان دراں ہنگام آیم، و در تو آویزم، و گویم کہ ایں آنکس ست کہ یک عمر مرا بہ محبت فریفت و دلم برد، و چوں من از سادگی بر وفا تکیہ کردم، و ایں را از دوستاں برگزیدم، نقش کج باخت و بمن بیوفائی کرد۔ خدارا بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد؟ و چہ عذر پیش خواہی آورد؟ وائے برمن کہ روزگار ہا گذرد و خبر نداشتہ باشم کہ سراج الدین احمد کجاست و چہ حال دارد۔ اگر جفا بپاداشِ وفاست، بسم اللہ ہر قدر توانی، بیفزائے کہ ایں جا مہر و وفا فراوان ست، لاجرم جفا نیز، باید کہ فراواں باشد و اگر خود ایں تغافل بہ باد افراہِ (یعنی بپاداشِ) جرمے دیگر ست، نخست گناہ را خاطر نشاں باید کرد، وانگاہ انتقام باید کشید، تا شکوہ درمیاں نگنجد و مرا زہرۂ گفتار نباشد۔ منم کہ معاشِ من از گونہ گوں رنج و رنگ رنگ عذاب بمعادِ کفار ماند، خون در جگر و آتش در دل و خار در پیراہن و خاک بر سر۔ ہیچ کافر بدیں روزگار گرفتار مباد، و ہیچ دشمن ایں خواری مبیناد۔ راست بہ تنہا روئے مانم کہ در صحرا پایش بگل فرو رود، و ہر چند

خواہد کہ بالا جہد، نتواند و فروتر رود. والا قدر نواب امین الدین احمد خان بہادر کہ گیتی را بر ویش دیدمے، و وصالش را زندگی دانستمے، بکلکتہ رہگرا شد. دیگر زندگی از بہر کہ خواہم و دل را بدیدارِ کہ شادماں دارم ۔ واماندگیِ من ازینجا تواں سنجید کہ نتوانستم ہمپائیش کردن و روا داشتم، اورا تنہا گزاشتن"۔

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین کو اپنے مقدمے کے بگڑ جانے کا حال اس طرح لکھتے ہیں :

"کارِ من بدادگاہِ دہلی، چنانکہ دانستہ باشید، تباہی گزید۔ حالیا براں سرم کہ اگر مرگ امان دہد، بازبداں در (یعنی درِ سپریم گورنمنٹ) رسم و دردِ دل بداں زمزمہ فروریزم کہ مرغانِ ہوا و ماہیانِ دریا را برخود بگریانم ہیہات! اگر معاشِ من ہمیں پنجہزار روپیہ سالانہ، ہم بدیں تفریق، از روے دفترِ سرکار ثابت شدہ بود۔ بایستے کہ صاحبانِ صدر مرا از پیش راندندے و گفتندے کہ ہرزہ مخروش، آنچہ تو باز یافت وانمودہٗ، یافتنی ازاں افزوں تر نیست، و قرارِ داد نیز ہمان ست ۔ لاجرم، دیوانہ بودمے، اگر بدیں کشور باز آمدمے و بایک قبیلہ (یعنی باجمعے کثیر)، کہ خویشان و برادرانِ من اند، بہ ستیزہ برخاستمے و بہ باطل ستیزی نام برآوردمے . . . .

"چہ کنم کہ کار برگشت، و روزگار برگشت. خدارا بنگر، و بہ دردِ دلِ من وارس۔ کولبرک بتوسطِ کرنیل ہنری املاک برمن مہربان شود و رپوٹے کہ خوشتر ازاں نتواں اندیشید، بصدر فرستد، و جوابے کہ سودمند تر ازاں نتواں سنجید، از صدر حاصل نماید۔ ہنوز آں جواب درراہ باشد کہ کولبرک معزول گردد۔ و ہاکنس کہ بجاے کولبرک نشیند، آنچہ برہم زدنِ ہنگامہ سلطنتے رابس باشد، از بہرِ من بصدر نویسد، و من دراں داوری (معاملہ) ازا

مسٹر اسٹرلنگ چشم یادری داشتہ باشم۔ ہنوز آں رپورٹ بصد نرسیدہ باشد کہ مسٹر اسٹرلنگ رہرو راہِ عدم گردیدہ باشد۔ چوں از ہمہ بگسلم و بدامنِ جارج سوئنٹن بہادر آویزم، گرم از جا برخیزد، و دامن بر شغلِ جہانبانی افشاند۔ سبحان اللہ! معزول نگردد، مگر کولبرک، بمرگ ناگاہ نمیرد، مگر اسٹرلنگ؛ بولایت نہ رود، مگر جارج سوئنٹن؛ درخورِ ایں صدمہ ہائے جانکاہ نباشد، مگر اسد اللہ دادخواہ۔۔۔۔۔"

مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک اور خط:

"دلنواز نامہ پس از عمرے رسید، و عمرے دیگر بخشید تا عمرِ باندوہ سپری شدہ را تلافی تواند کرد۔ امّا شاد کردنِ دلے کہ نہادش بہ غم سرشتہ باشد، نہ آسان ست۔ منم کہ چوں نامۂ شما رسیدے، مستانہ از جاے برجستمے، و جہاں جہاں نشاط اندوختمے، اینک تا چشم بہ سوادِ ایں صحیفہ دو چار شد، گیتی در نظرم تیرہ و تار شد۔ نخست آنچہ بنظر در آمد، خبرِ آشوب خبرے کہ دل تا جگر خون کرد۔ یعنی از جہاں رفتنِ خواہرِ عزیزِ شما ہے ہے امجد مرحومہ ہماں ست کہ تا در کلکتہ خبرِ رنجوریِ وے شنودہ بودید، دل از دست رفتہ بود، و سراسیمگی سراپاے خاطر را فروگرفتہ۔ در نظر دارم کہ از مردنش بر شما چہ قیامت گذشتہ باشد۔ توانا ایزدِ پاک شما را شکیب عطا فرماید، و تومندیِ دل و توفیقِ ثبات ارزانی دارد، و ایں سانحہ را در روزنامۂ عمرِ شما خاتمۂ مکارہ و مقطعِ مصائب گرداند۔

"آشکارا شد کہ مخدوم! مرا از علاقۂ تازہ خوشنودی نیست۔ ہر آئینہ انکشافِ ایں معنی غبارِ ملال بر دل فرو ریخت۔ خدا را دل تنگ نتواں شد، و کلکتہ را غنیمت باید پنداشت۔ شارستانے (معمورۂ) بدیں تازگی در گیتی کجاست؟ خاک نشینیِ آں دیار از اورنگ آرائیِ مرز بومِ دیگر خوشتر۔ من

و خدا کہ اگر متاہل نہ بودمے، و طوقِ ناموسِ عیال بگردن نداشتمے، دامن برہر چہ ہست، افشاندمے، و خود را دراں بقعہ رساندمے۔ تا زیستمے، دراں مینو کدہ بودمے، واز رنجِ ہواہای ناخوش آسودمے۔ زہے ہواہاے سرد و خوشا آبہاے گوارا، فرخا بادہ ہاے ناب و خرما ثمرہاے پیش رس:

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد غالب! آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد"

مولوی سراج الدین کو مرزا صاحب نے کسی واقعے کا قطعۂ تاریخ لکھ کر بھیجا ہے اور انھوں نے بغیرِ خواہش مرزا صاحب کے وہ قطعہ بہت سی مدح و ستایش کے ساتھ اخبار آیینۂ سکندر میں چھپوایا ہے۔ جب وہ پرچہ مرزا کی نظر سے گزرا ہے، تو اس کا شکریہ اور ایک اور خبر کے درج کرنے کی درخواست اس طرح کی ہے:

"گمنامے را نامور ساختن، وہیچے را ہمہ پنداشتن، عنایتے ست سترگ و مرحمتے ست بزرگ، خاصہ کہ آں سترگ عنایت بے ابرام داعی روے نماید، و آں بزرگ مرحمتے بے استدعاے سائل بظہور آید۔ نگرندہ اگر دیدۂ حق بین دارد، بنگرد کہ واجب تعالیٰ شانہ، اجزاے ممکنہ را کہ در کتمِ عدم متواری بودہ اند، بمحض عنایت پیرایۂ وجود بخشیدہ، و بران معدومات منت نہادہ۔ حقا اگر تاملے بسزا کردہ شود، رقم گشتنِ قطعۂ تاریخ درآیینۂ سکندر ازیں عالم خبری دہد۔ و چوں ناخواستہ اینچنیں نوازش بمیان آمد، ہر آیینہ روائیِ خواہش را چگونہ چشم نتواں داشت؛ لاجرم درگزارشِ مدعا فصلے بمیاں نہادہ آرزو را سرانجامِ گفتگو دادہ می شود۔

"نہفتہ مباد کہ قدر شناسیِ حکام رنگِ آں ریخت کہ فاضلِ بے نظیر و المعی یگانہ مولوی فضل حق از سرشتہ داریِ عدالتِ دہلی استعفا کردہ،

خود را از ننگ و عار وا رہاند۔ حقا کہ اگر از پایۂ علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد، یک وا ماندہ، و باز آں پایہ را بسر رشتہ داریِ عدالتِ دیوانی سنجند، ہنوز ایں عہدہ دونِ مرتبۂ وَے خواہد بود۔ بالجملہ بعد ازیں استعفا نواب فیض محمد خان رئیسِ جھجر، پانصد روپیہ ماہانہ برائے مصارفِ خدام مخدومی معیّن کرد و نزدِ خود خواند۔ روزیکہ مولوی فضل حق ازیں دیار می رفت، ولیعہدِ خسروِ دہلی صاحب عالم مرزا ابو ظفر بہادر مولانا را تا پدرود کند، سُوے خود طلبید، و دو شالۂ ملبوسِ خاص بدوشِ وے نہاد، و آب در دیدہ گرداند، و فرمود کہ "ہرگاہ شما می گوید کہ من رخصت می شوم، مرا جز اینکہ بپذیرم، گریز نیست۔ امّا ایزدِ دانا داند کہ لفظِ وداع بہ زبان نمیرسد الا بصد جرِّ ثقیل"، تا اینجا سخنِ ولیعہد بہادر ست۔ غالبِ مستہام از شما می خواہد کہ واقعۂ تودیعِ مولوی فضل حق، واندوہ ناکیِ ولیعہد بہادر، و بدرد آمدنِ دلہاے اہلِ شہر، بعبارتے روشن و بیانے دلآویز در آئینۂ سکندر بقالبِ طبع در آرید و مرا دریں تفقد منت پذیر انگارید والسّلام۔"

مولوی سراج الدین احمد نے خط اس مضمون کا بھیجا ہے کہ مرزا صاحب کچھ حالات پارسیوں کے اسلاف کے لکھیں اور کوئی ایسی کتاب کا نشان دیں، جس سے ان کے مفصّل حالات معلوم ہوں؛ نیز کسی تذکرے میں درج کرنے کے لیے مرزا کے اشعار کا انتخاب اور خود مرزا کا ترجمہ طلب کیا ہے۔ اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں:

"ہر نسیمے کہ ز کوُے تو بخاکم گذرد
یادم از دلولۂ عمر سبکتاز دہد

رسیدن مہر افزا نامہ دل بُرد، و جاں بخشید۔ اگر چہ آں جان با من نماند، وہم بر سر آں نامہ بہ فشاندن رفت، لیکن سپاسِ دلربائی و جاں بخشی باقی ست

امید کہ تا جانِ بخشیدۂ یزداں در تن ست، گزاردہ آید۔

"مخدومِ من در رسیدنِ نامۂ پیشیں دو دل (متردد) چراست؟ ہنوزم نشاطِ ورودِ آں نمیقہ در دل، وسوادِ سطورِ آں صحیفہ در نظر جا دارد۔ چوں فرماں چناں بود (یعنی در نامۂ پیشیں)، کہ غالبِ خویشتن نشناس لختے از رسم و راہ ستر گانِ پارس برگوید، وکتابے ازاں گروہ نشان دہد کہ رازِ آں دیریں کیش و سازِ ایں باستانی زبان، ازاں اوراق تواں یافت۔ لاجرم دانشِ من (علمِ من) اندازۂ سرانجامِ پاسخ آں برنتافت (تحمل نکرد)، چوں دو بارہ گفتند کہ خواہش چنین ست، ناچار مہرِ خموشی از دہان و پردۂ شرمِ نادانی ازمیاں برداشتہ، میگویم کہ روائیِ ایں خواہش از ہیچ کس چشم تواں داشت، وخود را بہ بندِ ایں پژوہش (تلاش) خستہ نتواں کرد۔ نگارندۂ دبستانِ مذاہب باایںہمہ لاف آشنا روئی (واقفیت) آنچہ می گوید، نہ ہمہ است نہ ہمہ برجائے خود ست (یعنی نہ مکمل ست و نہ سراپا صحیح ست)، پارسیاں در سورت و بمبئی آشیاں دارند، زینہار گمان نبری کہ ازاں گروہ (یعنی از سترگانِ پارس) جز نام، نشان دارند۔ آں پویہ و آں ہنجار (یعنی آں روش و آں طریق) وآں نگارش و آں گفتار ندانند، و جز تخمہ و نژاد از روئے شیوہ بپارسیاں نمانند۔ پارسیاں از گرانمایگانِ روزگار و برگزیدگانِ دادار بودہ اند، و بہ روزگارِ فرماں روائیِ خویش دانشہائے سود مند (علومِ مفیدہ)، وکنشہائے خرد پسند (اخلاقِ پسندیدہ) داشتند۔ کشایشِ رازِ خرامشِ ہفت سپہر، ونمایشِ اندازۂ گردشِ ماہ و مہر پدید آوردنِ رخشندہ گہرہا از تہِ خاک، و بدر کشیدنِ بادۂ ناب از رگِ تاک، پژوہشِ اسبابِ خستگی و رنجوری، وگزارشِ احکامِ پزشکی (طبابت) و چارہ گری، پردہ کشائیِ فہرستِ اسرارِ کیائی (سلطنت) وفرماندہی، و

رصدبندیِ تقویمِ آثارِ بندگی و فرمانبری، عنوانِ بیک دگر بستنِ رنگ رنگ گہرہا، و ہنجارِ سرہ کردنِ گونہ گوں ہنرہا، داروگیاہا فزا خورِ ہر درد بکار اندر آوردن، و پرندگانِ ہوا و درندگانِ دشت را بہ شکار اندر آوردن؛ کوتاہی سخن، والائیِ اندازِ ہرگونہ بنیش، و پیدائیِ اندازۂ کمالِ آفرینش، ہمہ در آیینۂ اندیشۂ ایں فرزانگاں رُوئے نمودہ۔ و انگیزش بایستگیِ گفتار و کردار کہ اکنوں بہ اندکے ازاں بسیار نازند، از مغزِ دانشِ ایں فرہنگیاں بودہ است۔ گنجینۂ خسروانِ پارس را از ہر علم دفترے بود و ہر دفتر ازگرانمایگی گنجِ گوہرے۔ چوں دولت ازاں طائفہ رُوے برتافت و سکندر ابن فیلقوس برایران دست یافت، کتبِ خاصۂ خسروی بتاراج رفت۔ امّا آنچہ پراگندہ بود و گمنام بہر گوشہ و کنار داشتند، برجا ماند، تا بہ روزگارِ پیروزیِ تازیاں دراں کشش و کوشش از ہر جا گرد آمد (فراہم آمد)، و بر فرمانِ خلیفہ افروزینۂ گلخن گرما بہاے (حمام ہاے) بغداد شد۔ ہمانا احکامِ آذر پرستی ہم بہ آذر بازگشت۔ زبان آورانِ عرب پارسی را بتازی آمیختند، و زبانے تازہ برانگیختند۔ اکنوں کیست تا بداں زبانِ کہن سخن درست تواند گفت، و ازاں دیریں آیین براستی خبر تواند داد۔ پژوہندۂ ایں راز را کام دل برنیاید، و من ضامن کہ ہر چہ پس از فراواں جستجو فراہم آرد، نہ آنچناں باشد کہ دل بداں تواں نہاد۔

" دیگر آنچہ کلکِ مشکبار بداں رفتہ کہ منتخبے ازگفتارِ ناروائے خود برنگارم دستے از ماجراے خو برگزارم ۔ اندیشہ را بہ لب گزیدن و خرد را بشگفت زار (درمحلِ تعجب) افکند:

چگویم از دل و جانے کہ در بساطِ من ست ستم رسیدہ یکے، ناامیدوار یکے

از چه بداں ارزم و مرا ایں پایہ از کجا باشد کہ ستودگان مرا ستایند، وگفتارِ مرا در تذکرۂ شعرا جا دہند ۔ از فرجامِ فرہمندیِ ہستی (یعنی از شان و شکوہِ ہستی) و سرو برگِ پیدائی کہ نزدِ آشکارا بیناں زود زوال، و بوالا دیدِ یکتا گزیناں (یعنی قائلانِ وحدتِ وجود) نمودِ بے بود ست ۔ آنچہ بمن دادہ اند، زبانے ست یاوہ سرائے و خامہ ایست بیہودہ پوے ۔ من ہم از بے مایگی چوں کودکان کہ درم از سفال سازند و بہ گنجینہ داری نازند سرودۂ زبان و بیہودۂ خامہ را (یعنی کلامِ خود را) پارہ پارہ بہم بستہ و ریزہ ریزہ یکجا کردہ ۔ بگمانِ نام آوری کہ دل از تابِ اندوہِ ناروائی آں خون ست ۔ دیوانے ترتیب دادہ ، جا بجا بنظرگاہِ التفاتِ یاراں فرستادہ ام ۔ بزرگانے کہ بہ پرسشِ غالبِ مستمند روے آرند، سوادِ ہر غزلے کہ خواہند، ازاں اوراق بردارند کہ انتخاب و التقاطِ اشعار حوالہ بہ رائے نامہ گرد آور (یعنی مولفِ تذکرہ) است نہ باشارہ و ایمائے سخنور . . . . . اما اگر گزارشِ حالِ سخنور ہوس ست ، خود ایں مایہ بس ست کہ چوں در جریدۂ آں فن از من سخن رانند، سخن را در ستایشِ من بدیں گونہ بہ کرسی نشانند کہ از ناکسانِ روزگار و بیکسانِ دہلی دیار، مسلمان زادہ ایست کافر ماجرا و گبریست مسلمان نما، کہ از غلط نمائی غالب تخلص می کند و بدیں رنگ ژاژ می نماید :

خرسندیِ غالب نبود زینہمہ گفتن   یک بار بفرمائے کہ اے ہیچکسِ ما!

پنہاں نماناد کہ در اصل آفرینش از دودۂ روز فرود رفتگان ، و حلقۂ بخت برگشتگاں ، ستم رسیدۂ و روے بہی نا دیدہ گسم ، آرایشِ سخن پیش کش (یعنی بر طرف) ترک نژادم ، و نسبِ من با فراسیاب و پشنگ می پیوندد۔

بزرگانِ من از آنجا کہ با سلجوقیاں پیوندِ ہم گوہری داشتند، و بعہدِ دولتِ ایناں رایتِ سروری و سپہبدی افراشتند۔ بعدِ سپری شدنِ روزگارِ جاہ مندیِ آں گروہ (یعنی سلجوقیاں) چو ناروائیٔ (اکساد بازاری) و بینوائیٔ رُوے آورد، جمعے را ذوقِ رہزنی و غارتگری از جاے بُرد، و طائفہ را کشاورزی پیشہ گشت۔ نیاگان مرا بہ توران زمین، شہر سمرقند آرامشگاہ شد۔ ازاں میانہ نیاے من از پدرِ خود رنجیدہ آہنگِ ہند کرد، و بہ لاہور ہمراہی معین الملک گزید۔ چوں بساطِ دولتِ معین الملک در نوشتند، بدہلی آمد، و با ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خان بہادر پیوست۔ زاں پس پدرم عبداللہ بیگ خان بشاہجہان آباد بوجود آمد، و من بہ اکبرآباد۔ چوں پنج سال از عمرِ من گذشت، پدر از سَرَم سایہ برگرفت۔ عمّ من نصراللہ بیگ خان چوں خواست کہ مرا بہ ناز پروَرد، ناگاہ مرگش فراز آمد۔ کما بیش پنج سال پس از گذشتنِ برادر پے مہین برادر برداشت، و مرا دریں خرابہ جا تنہا گذاشت۔ وایں حادثہ کہ مرا نشانۂ جاں گدازی وگردوں را کمینہ بازی بود در سالِ ہزار و ہشت صد و شش عیسوی بہنگامِ ہنگامۂ لشکر آرائیٔ وکشور کشائیٔ صمصام الدولہ جرنیل لارڈ لیک بہادر بروے کار آمد۔ چوں عمّ مرحوم از دولتیانِ دولتِ اہلِ فرنگ، و با انبوہی چار صد سوار برکابِ صمصام الدولہ، با سرکشاں سرگرمِ جنگ بود، و ہم از بخشش ہاے سرکارِ انگریزی دو پرگنۂ سیر حاصل از مضافاتِ اکبرآباد، بہ جاگیر داشت۔ سپہ سالارِ سرکارِ انگلشیہ بہ خونبہاے آفتاب (یعنی نصراللہ بیگ خان)، کلبۂ تارِ گدایاں را چراغ و ما بینوایاں را بعوضِ جاگیر بمشاہرۂ از خار خارِ جستجوے وجہِ معاش فراغ بخشید۔ تا امروز کہ شمارۂ نفس شماریِ زندگانی بہ چل و چار میرسد، بداں راتبہ خُرسندم، و بداں مایہ قانع۔

در سخن از پرورش یافتگانِ مبداء فیاضم ، و سوادِ معنی را بفروغِ گوہرِ خویش روشن کردہ ام ۔ از ہیچ آفریدہ حق آموزگاریم بگردن و بارِ منتِ رہنمائیم بر دوش نیست ۔

غالب بگہر ز دودۂ زادشمم — زاں رو بصفائی دمِ تیغست دمم

چوں رفت سپہبدی ازدم چنگ بشعر — شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

نامہ بہ پایاں رسید ، و شرم پراگندہ گوئی و درازنفسی بر من اشتلم کرد ۔ دیدہ ور داند کہ گفتنی فراواں بود ، و افسانہ پریشاں ؛ تا کجا اندک گفتمے ، و گفتار را از درازی نگاہداشتمے ۔ مرادر آنچہ رفت ، گناہے نیست ۔ و اگر خود گناہ ست ، دوست کریم ست و کرم عذر خواہ ۔ والسّلام :

منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص کے باپ رلے چھجمل دہلوی نے مرزا کو جب کہ وہ کلکتے میں ہیں ، ایک رئیس کی نسبت جو اپنے باپ کی جگہ مسند نشین ہوا ہے ، لکھا ہے کہ وہ حکیمانہ طریقہ رکھتا ہے اور سخاوت اس کی جبلّت میں ہے ۔ اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں :

" ایک گفتی ، فلانے روشِ حکیمانہ دارد ، و دنبارا کار آگاہانہ می گزارد ، با ایں ہمہ اندوہناکی خندہ ام در گرفت ، و عنانِ ضبطِ خویش از کفم بدر رفت ۔ ندانی کہ براسپانِ بادرفتار بر نشستن و گروہا گروہ مردم راپیشاپوش دوانیدن ، تن را بلباسِ رنگارنگ برآراستن ، و معدہ را بہ الوان خوردنیہا ممتلی گردانیدن ، شہوہ از اندازہ بیروں راندن ، و غبارِ معصیت برفرق افشاندن ، از حکما نیاید ، و پزشکان را نشاید ۔ کارِ دانشوراں چیست ؛ دور از آبادی در بنِ کوہے نشستن ، واز شش جہت در بروے خلائق بستن ، تن را بہ ریاضت فرسودن ، و جاں را بخردی پالودن ۔ ہر کہ حکیم

خود گزیں ست، کار و بارش این ست. بے برگ و نوائے از شکنجۂ گوناگوں حسرت یدر جستہ بہ فراخ نائے سرخوشی و مستی، رسیدہ است، از کجا کہ آزادہ رَو و بالطبع کریم بود. ہنوز ادعیۂ منی از ریاح غلیظۂ صالحۂ کبدیہ ممتلی دارد، ہر آئینہ بفرمانِ بادست. روزے چند باش تا بنگری گرہ بر کیسۂ زر زناں، و در حسرتِ زرِ تلف کردہ زاری کناں۔ ایں کہ فلاں و بہماں را از نزدِ خویشتن راندہ است، حقا کہ رُوے در مصلحتے نداشت، و ہر چہ کرد، از بیخردی و ابلہی کرد۔ چہ اگر دانا بودے، و خرد داشتے آناں را کہ راندہ است، نہ راندے، و کارہا از آناں گرفتے۔ و ایناں را کہ با خود در یک پیرہن جادادہ است، چوں غبار از دامن افشاندے، و ہرگز بہ ہوائے ایناں نرفتے۔ کودکی و بے حاصلی ورزید، مگر در ایامِ صاحبزادگی و ولیعہدی از آناں دلے پُر داشت و با ایناں لختے رام بود۔ از آناں دل بدیں خیرگی خالی کردن، و در دامِ ایناں بدیں کوری در آمدن، نہ بفرمانِ دانش ست، نہ بفرمانِ بینش۔ حکیم کرا میگوئی؟ و کرم پیشہ کرا میخوانی؟ ..... چوں سخن دریں باب بسیار ست، نامہ بہ دُعا ختم می کنم۔ دیدہ را بینشے درست و دل را دانشے سُودمند روزی باد۔"

مولوی محمد علی خان صدر امین باندہ جن سے مرزا باندے میں مل کر کلکتے روانہ ہوئے ہیں، کلکتے میں پہنچ کر ان کو سفر کی تمام رویداد لکھی ہے۔ اس کے آخر میں لکھتے ہیں:

"روز سہ شنبہ چارم شعبان پارۂ از روز برآمدہ در کلکتہ رسید۔ غریب نوازیہائے وہّابِ بے منّت را نازم کہ در چنیں دیارِ خانۂ چنانکہ باید، و ہرگونہ آسائش را بکار آید؛ ہم اُدرا باندازۂ فراغِ خاطرِ آزادگاں

فضائے، وہم اندرو مانندِ دہانِ آزِ دنیا طلباں بیت الخلائے۔ درگوشۂ صحن پُر از آبِ شیریں چاہے و بر طرفِ بام در خورِ اہلِ تنعّم آرامگاہے۔ بے آنکہ جستجوئے رود، یا گفتگوئے شود، بے منت و بے زحمت بکرایۂ دہ روپیہ ماہانہ بہم رسید، و آدم و چار دارا تکیہ گاہِ آرامش گردید۔ دو روز از رنج راہ آسودہ منشور لامع النّور (یعنی سفارش نامۂ مولوی محمد علی خان) را مشعلِ راہِ مُدّعا ساختم و در کشتی نشستہ آہنگِ ہگلی بندر کردم۔ لطفِ ملاقاتِ نواب علی اکبر خان طباطبائی، اگر گویم کہ مراز بخت عجب آمد، رواست؛ و اگر گویم کہ مرا برمن برشک آورد و نیز جا دارد بخدائیکہ خرد آفریدہ و خرد ور برگزیدہ، بدیں گرانمایگی و صاحبدلی در بنگالہ دیگرے نخواہد بود۔ یارب! ایں گوہر گرامی از کدام کان ست، و ایں گرامی گوہر (گرامی ذات) از کدامیں دُودماں۔ بارے چوں نخستیں صحبت بود، بچارہ جوئی و مصلحت پُرسی دردِ سرندادم، و دو سہ ساعت نشستہ بغمکدہ باز آمدم۔ آوخ (افسوس) کہ دریں روز ہا نواب را با محکامِ ہگلی در خصوصِ زمینے کہ وقفِ امام بارہ است معارضہ درپیش و دل سرگرم فکرِ کارِ خویش ست۔ و للہ دُرّ القائل۔

ہمہ را ماتمی حسرتِ دنیا دیدم — چوں بعشرت کدۂ گبر و مسلماں رفتم

روزگار فرمانبرد بخت فرماں پذیر باد۔"

ایک اور خط میں مولوی صاحب ممدوح کو دیگر حالات کے بعد کلکتے کے مشاعروں اور اپنے معترضوں کا حال اس طرح لکھتے ہیں:

"از نوادرِ حالات اینکہ سخنوران و نکتہ رسانِ ایں بقعہ پس از ورودِ خاکسار بزمِ سخن آراستہ بودند۔ در ہر ماہِ شمسی انگریزی روزِ یکشنبۂ نخستیں

سخنگویاں در مدرسۂ سرکار کمپنی فراہم شدندے، و غزلہاے ہندی و فارسی خواندندے۔ ناگاہ گرانمایہ مردے کہ از ہرات بسفارت رسیدہ است، دراں انجمن می رسد، و اشعارِ مرا شنودہ بہ بانگِ بلند می ستاید، و بر کلام نادرہ گویانِ ایں قلمرو تبسّم ہاے زیر لبی می فرماید۔ چوں طبائع بالذّات مفتونِ خود نمائی ست، ہمگناں حسد می برند، و کلانانِ انجمن و فرزانگانِ فن بر دو بیتِ من اعتراضِ نادُرست برآوردہ، آنرا شہرت میدہند۔ ولے آنکہ مرا زباں بپاسخ شنا شود، از دانشوراں کہ مخدومی و ملاذی نواب علی اکبر خان و مکرمی و مطاعی مولوی محمد محسن از آنانند، جوابہا می یابند، و بپس زانوے خموشی می نشینند۔ چنانچہ ہم بہ فرمانِ ایں دو بزرگوار مثنوےے انشا کردہ ام، و بعد از اظہارِ عجز و انکسارِ خویش جوابہاے اعتر دراں ابیات موزوں ساختہ، و آں مثنوی (یعنی مثنوی بادِ مخالف) پسندیدۂ طبعِ عالمے افتادہ است۔ انشاء اللہ العظیم زیں بعد عریضہ، کہ بہ والا خدمت خواہد رسید، ورقے ازاں ابیات در نوردِ آں خواہد بود۔"

نواب ضیاء الدین احمد خان اکبر آباد گئے ہوئے ہیں۔ مرزا ان کو اپنے قدیم وطن اکبر آباد کی یاد میں دلّی سے اس طرح لکھتے ہیں:

"جانِ برادر! اشک و آہِ غالبِ نامراد، یعنی آب و ہواے اکبر آباد بہ شما سازگار باد۔ گرفتم کہ خود را بسفر گرفتہ (یعنی فرض کردہ اید) و نزدیکِ خود (یعنی بدانستِ خود) از من دورتر رفتہ آید، امّا چوں ہنوز در وطنید ہمانا کہ نزدیک بامنید۔ شادم کہ شوقِ دور اندیش دیدہ و دل را دریں سفر با شما فرستاد، تا ہمدریں غربت (یعنی در دہلی)، دادِ شادمانیِ دیدارِ وطن نیز توانم داد۔ زینہار، اکبر آباد را بچشمِ کم (یعنی بچشمِ حقارت) ننگرند، و از

رہگذرہاے آں دیار، الحفیظ گوے، والاماں سراے، گذرند کہ آں آباد چہ ویران و آں ویرانہ آباد، بازیگاہِ ہمچو من مجنونے، و ہنوز آں بقعہ را در ہرکفِ خاک چشمۂ خونی ست۔ روزگارے بود کہ دراں سرزمین جز مہرگیا (نام رستنی)، نہ رُستے و ہیچ نہال جز دل بار نیاوردے۔ نسیم صبح دراں گلکدہ (یعنی آگرہ)، بہ مستانہ وزیدن، دلہا را آں مایہ از جا برانگیختے (یعنی بشورش آوردے)، کہ رنداں را ہواے صبوحی از سرِ پارسایاں را نیتِ نماز از ضمیر فرو ریختے۔ ہرچند ہر ذرّۂ خاکِ آں گل زمین را از تن پیامے بود دلنشیں، و ہر برگِ آں گلستاں را از جاں درودے بود خاطر نشاں، امّا تازگیِ وقتِ شما را در نظر داشتہ، در دو پردہ شورِ پُرسش برانگیختہ بود و چشم براہ داشت کہ کے نویسند و دریغ کہ ہیچگاہ نوشتند کہ رخشِ سنگیں (یعنی اسپِ سنگیں کہ در اکبرآباد معروف است)، دعاے مرا بکدام ادا پذیرفت؟ و دریا بپاسخِ سلامِ من بہ زبانِ موج چہ گفت؟"

نواب عبداللہ خان صدرالصدور میرٹھ برادرِ نواب محمد سعید خان مرحوم رئیسِ رامپور نے مرزا کو لکھا ہے کہ رئیسِ ممدوح کی شان میں قصیدہ لکھو۔ مگر اس زمانے میں مرزا پریشان بہت ہیں۔ اس لیے ان کے جواب میں لکھتے ہیں:

"خدامِ بلند مقام کہ سرانجامِ قصیدہ از غالبِ بے نوا چشم داشتہ اند، مگر آں فرسودہ روانِ افسردہ دل را کہ ہنوز نہ مُردہ است، زندہ پنداشتہ اند۔
گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی　　بدست مرگ، ولے بدتر از گمانِ تو نیست
کاش کشایشِ ایں کار چوں صنعتِ نقّاشی و گلدستہ بندی تنہا بکوششِ دست و بازو صورت بستے۔ تا چشم از خستگیِ دل پوشیدمے، و فرمان پذیرانہ

در پرداز‌شِ کار کوشیدمے۔ چہ کنم، چوں سرِ ایں رشتہ در دستِ دلست، تا دل بر جائے نباشد، زبان سخن سرائے نباشد۔ دیدہ ورانِ صاحبدل دانند کہ چہ قدرہا دیدہ و دل بہم آمیختہ شود، تا نقشے، بداں شگرفی کہ بالغ نظراں پسندند، انگیختہ شود۔ ایں دل شکستۂ بہم نہ پیوستہ کہ در سینۂ من و ہمانا دشمنِ دیرینۂ من ست، زنہار بکارِ سخن گستری نباید و معنی آفرینی را نشاید....."

قاضی عبدالجمیل بریلوی نے کچھ غزلیں اوّل ہی مرتبہ اصلاح کے لیے بھیجی ہیں، اس کے جواب میں اصلاح کے متعلق لکھتے ہیں:

"خواہشِ محک و اصلاح مہر افزود۔ چندانکہ دیدہ بداں سواد دوختم، ناز یبا صورتے بنظر در نیامد۔ ہنجار و روش خود از نیرو ہائے درونی ست۔ آرے، نَے خامہ در بُنانِ ہرکس خرامے دیگر دارد؛ آموزش را دریں پردہ راہ نیست۔ و اگر گویند، ہست ہر آئینہ می توانم گفت کہ نیست، مگر بہ ہمنشینی و ہمزبانیِ آموزگار، و بسر بردنِ روزگار در سَرہ کردنِ گفتار۔ چوں صحبت صورت ندارد، وگفتہ آمد کہ ہرچہ بہر نمط گفتہ اند، نہ غلط گفتہ اند، می باید حلقہ بر درِ دل زد و ہمت از مبدار فیاض دریوزہ کرد۔ بکثرتِ مشق، و فراوانیِ ورزش، و پیرویِ رہروانِ راہ دان کشاکشہا رُوے خواہد نمود، و اندیشہ را دستگاہ وگفتار را سرمایہ خواہد افزود"

مولانا فضل حق مرحوم کو ایک خط میں خط نہ بھیجنے کی شکایت لکھی ہے اور ایک قصیدہ جو حمد میں عرفی کے رب سے پہلے قصیدے پر لکھا ہے، خط کے ساتھ بھیجا ہے اور اس کی داد چاہی ہے۔ وہ خط بجنسہٖ لکھا جاتا ہے:

"سبحان اللہ! باآنکہ از فرامش گشتگانم، دانم کہ دوست مرا بہ دو جو بلکہ بہ نیم
خس برنگیرد۔ ہرگاہ بساز دادنِ آہنگِ گلہ زُوے آرم، وسنجم کہ ایں پردہ
(یعنی نغمہ) را بے پردہ (یعنی بے تکلف) می توانم سرود، واز قہرمانِ
اندیشہ دورباشے (یعنی امتناعے)، درمیان نیست۔ ہرآئینہ بدیں شادمانی
کہ ہنوزم با دوست رُوے سخنے ہست، آنچناں برخویشتن می بالم کہ غمِ جانگداز
فراموشی فراموش، ولب از زمزمۂ کہ دل در بندِ سرودنِ آنست (یعنی شکایت
خاموش می گردد۔

از خویشتن بذوقِ جفا باتو ساختیم — باما دگر مساز کہ ما با تو ساختیم

دریں روزہا ہوائے آں در سرافتاد کہ بیتے چند در توحید مجیباً لعُرفی گفتہ آید۔
چوں کوششِ اندیشہ بجائے رسید کہ نہ عرفی را محل ماند ونہ مرا جاے، ناگزیر
آں ابیات را بر کسے عرضہ میدارم کہ چوں من صد وچوں عرفی صد ہزار را بسخن
پرورش تواند کرد، وپایۂ ہریک بہر یک تواند نمود۔ والسّلام"

یہاں تک، ہم نے مرزا کے مکاتبات میں سے جو بجائے خود ایک دفترِ
طویل الذیل ہے، کسی قدر صاف اور سلیس عبارتیں انتخاب کرکے لکھی ہیں۔
اگرچہ اس قسم کی اور بہت سی عبارتیں اور خطوط مرزا کے مکاتبات میں
سے انتخاب ہو سکتے ہیں، مگر کتاب کا حجم بہت بڑھ گیا ہے، اس لیے
ہم اسی قدرِ قلیل پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس انتخاب کے بعد ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کی دلچسپی
کے لیے ان مشہور اُستادوں اور نثاروں میں سے جن سے ہندوستان کے
لوگ بخوبی واقف ہیں، چند شخصوں کی نثر کا مقابلہ مرزا کی نثر سے اس طرح
کیا جائے کہ جو عبارتیں مرزا اور دیگر اشخاص کی نثروں میں متحد المضمون پائی

جائیں، ان کو ایک دوسرے کے محاذی لکھ دیا جائے اور اس بات کا اندازہ کرنا کہ کونسا مضمون کس پائے کا ہے اور کون ساکس درجے کا، ناظرین کے ذوق و وجدان پر چھوڑ دیا جائے۔

سب سے پہلے ہم دو متحد المضمون مقام سہ نثر اور مہر نیمروز سے نقل کرتے ہیں۔ ظہوری نے دوسری نثر میں ابراہیم عادل شاہ والیِ بیجاپور کی نو صفتیں الگ الگ بیان کی ہیں، جن میں سب سے پہلے معرفتِ الٰہی کا ذکر کیا ہے اور شاعرانہ مبالغے کے ساتھ اپنے ممدوح کو اس صفت سے موصوف کیا ہے۔ مرزا نے مہر نیمروز کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد بہادر شاہ مرحوم کی مدح کے موقع پر اپنے شاعرانہ انداز میں ان کو بادشاہی اور درویشی کا جامع قرار دیا ہے اور مثل ظہوری کے نظم و نثر دونوں میں یہ مضمون ادا کیا ہے۔ ہم دونوں کتابوں سے وہ مقامات مقابلِ یکدگر نقل کرتے ہیں:

ظہوری

تاجداریِ لفظ و معنی بہ حشمتِ ثنائی تارک آرنیست کہ سمی خلیل خود یعنی ابراہیم عادل شاہ را در ہفت اقلیم بہ نہ صفت یگانہ و ممتاز گردانیدہ۔ اوّل معرفت کہ با وجود حجب کثرت در مشاہدۂ شاہدِ وحدت معنی کلامِ معجز نظام "لو کُشِفَ الغطا، لَما ازددت یقیناً"

غالب

از انجا کہ بعدِ ہر دَور طورے دیگر ست، و پس از ہر انجام سر انجامے جداگانہ؛ در ہر عہد عہدِ اسمے دیگر است (یعنی اسمے دیگر از اسمائے الٰہی) و در ہر وقت وقفِ کشایشِ طلسمے دیگر. فرۂ ایزدی (نشانِ الٰہی) کہ چندے را بنام آوریِ شکوہِ عزّ و غنا از سیما درخشیدے، واندے را بہ نشامندیِ فقر و فنا فروغ بخشیدے، مظہرے

وصفِ حال او ساختہ، گلستانِ
نیت و بوستانِ عقیدتش از خس و
خاشاکِ شک و شبہ پرداختہ مجموعۂ
عرفانِ موحداں فردے از دفترِ
شناسائیش عنف و اشکلم ماسوے
پسندیدۂ طبع مواسائیس بہ توضیحِ
بیانش نشانہائے بے نشاں (یعنی
ذاتِ بے نشاں)، ہمہ دلنشین و
خاطر نشان۔ بہ آفتابِ جہاں گرد
تاکیدِ نظر بر دو بینان نینداختن
و بہ مصورِ قضا تہدید با حوالِ احوال
نپرداختن زنار را بہ سبحہ پیوندیست
کہ گسیختنش برکشاکشِ کشیشاں
(یعنی قسیساں) نہ خندد، وکفر را
با ایماں نہ سریست کہ صُداعش
صندلِ چارہ از پیشانیِ برہمناں
نبرد۔ از صدمۂ توحیدش دوئی
در یکی گریختہ، و بہ علاقۂ تجریدش
خودی در توئی آویختہ گوشے
حق شنو، چشمے حق بین، دلے
حق جو، خاطرے عرفان را سینۂ
کامل و مرآتے روشن خواست۔ تا دراں
مظہرِ ظہور بہر دو رنگ، و دراں مرآت رؤیت
بہر دو صورت، یکبارہ رُو دہد۔ اورنگ و
منبر یکے شد و وسادہ و سجادہ را دوئی از
میان رفت۔ درفشِ کاویانی (کہ نشانِ
بادشاہی است) از عصا و ردا (کہ ہر دو
شعارِ درویشاں و ہر دو در درفش جمع آمدہ)
منت پذیرفت کہ پیدائیِ من بہ پیوندِ ایں
دو جزو باز بستہ است، و عصا و ردا درفش را
سپاس گفت کہ دریں صفحہ (یعنی در درفش)
نقشِ جمعیتِ ما رسا نشستہ است۔ بیکدگر
خوردنِ ایں دو قدح (یعنی فقر و سلطنت)
مجمع البحرینے پدید آورد، و بہم آوردنِ
ایں دو قوس نقشِ دائرہ پدیدار کرد۔ از سرجوشِ
فروغِ مہر و ماہ بافشردن و پالودن و سرشتن پیکرے
ساختند و بہرِ دفعِ گزندِ چشمِ بد از پروین و پرّن
براں پیکر سپند سوختند سرش را تاجِ شاہی
افراختند، و دلش را بنورِ الٰہی افروختند.... زہے
در انجمن خلوت نشین و بہ پادشاہی کارآگہی

۵ـ مسند

معرفت خیز، تار کے آسماں سا، جبہۂ سجدہ ریز

گزیں۔ پادشاہاں در انجمن ازاں کارآگاہ ادب آموختہ، وکارآگاہاں در خلوت ازاں پادشاہ فیض اندوختہ۔

ظہوری

مثنوی

پاے رفعت بر آسماں دارد
سرِ خدمت بر آستاں دارد
در عبادت بہ گفتن و دیدن
طرزِ او طرزِ حق پرستیدن
خلوتِ دیگران و صحبتِ او
وحدتِ این و آن و کثرتِ او
در دلش این و آں نمی گنجد
ہیچ جز حق دراں نمی گنجد
بت شکن گشت چوں خلیل نخست
بادش ارزانی اعتقادِ درست
کفر در فکرِ نکتہ، عرفاں
شرک در شکرِ نعمتِ ایماں

غالب

مثنوی

اے کہ از رازِ نہاں آگہ نہٖ
دم مزن از رہ کہ مردِ رہ نہٖ
"در ہزاراں مرد، مردِ رہ یکیست
آدمی بسیار، اما شہ یکیست"
ور تو می پرسی کہ مردِ راہ کیست
جز سراج الدین بہادر شاہ کیست
در طریقت رہنماے رہرواں
در خلافت پیشواے خسرواں
آنکہ چوں از رازِ وحدت دم زند
دفترِ کون و مکاں برہم زند
آنکہ چوں در نے نوا را سر دہد
نے شود نخلے کہ شبلی بر دہد

یہ شعر مثنوی معنوی کا مشہور ہے، اسی لیے مرزا نے بغیر حوالے کے یہاں لکھ دیا ہے اور شہ کے لفظ نے نہایت لطف پیدا کر دیا ہے۔

طینتش باج خواہِ طینت ہا
نیتش پادشاہِ نیت ہا
در عبادت زہے تو منددی!
بندگی در خورِ خداوندی
سرِ وحدت بمغز بُرد از پوست
ہمہ او کرد خویش را، ہمہ اوست

شبلی، از منبر دہد آوازِ عشق
شاہِ ما، بر تخت گوید، رازِ عشق
عشق دارد پایہ در ہر کس بگاہ
منبر از شبلی و تخت از پادشاہ
آنچہ ابراہیم ادہم یافتست
بعدِ ترکِ مسندِ جم یافتست
شاہِ ما دارد بہم در رہروی
خرقۂ پیری و تاجِ خسروی
شاہی و درویشی اینجا باہم ست
پادشاہِ عہد قطبِ عالم ست

شیخ علی حزیں اور مرزا کے طرزِ بیان کا مقابلہ

شیخ نے جو اپنے دیوان کا دیباچہ لکھا ہے، اس میں وہ فخریہ فقرے جو اس نے اپنے دیوان اور اپنے کلام کی شان میں لکھے ہیں، اسی قسم کے فقرے مرزا نے بھی دیوان فارسی کے دیباچے میں انشا کیے ہیں۔ سو دونوں دیباچوں میں سے ہم ملتے جلتے فقرے انتخاب کر کے اس مقام پر ہم مقابلِ یکدگر لکھتے ہیں:

حزیں

ہمایوں خطبۂ ایست لبالب از جواہرِ کلم و جوامعِ حکم۔ روح پرور ہوائیش ربیعی اعتدال و جداولِ سطورش از ماء

غالب

بنامِ ایزد نخستیں نقابیست از روے شاہدِ ہر ہفت کردۂ معنی بجنبشِ نسیم برافتادہ یعنی کشاکشِ دستِ ناکشیدہ۔

معین مالامال، خاکش مشکیں نفس
و شمیمش عنبر آگیں، آبش خمار
شکن و نسیمش مسیح آیین، از
صبوحی فیضے کہ ساقیِ کلکش
پیمودہ، سیاہ مستانِ حروف
سر درکنار ہم غنودہ اند، واز نشۂ
ہوش پروازے کہ دستِ
فکرت در جام و سبوے الفاظش
ریختہ، خرد مستانِ معنی نشید
شوق سرودہ۔ بنام ایزد حسنِ لیلیٰ
ست کہ طرفِ خیامِ الفاظ سر بر
زدہ در جلوہ گری ست، یا شورِ
مجنونے ست کہ از وادیِ تفسیدہ
دل برخاستہ در پردہ درلیست
یوسفستانے ست از گل پیراہناں
در موج نگارستانے ست
سیمیں بدنانش فوج در فوج،
سہی پیکرانند در خیابانِ سطور
دوشادوش، مغان شیوہ دلیرانند
از بادۂ ناز گرم نوشانوش،
نازک بدنانند حجاب پرور، گل

باز پسیں چراغیست از گرمیِ چراغانِ
نیم سوختہ، پہلو رُخ بہ افروختن دادہ،
یعنی داغِ منتِ خس نادیدہ یکہن داغہاے
جنون ست سراسر بہ ناخنِ شوخیِ نفس
خراشیدہ۔ گرما گرم خونابہ دردنست بہ
تفِ پنہانیِ دل ناگہ از ناسور ترادیدہ۔
کاغذیں پیرہنانند (یعنی دادخواہانند)
چوں پیکرِ تصویر از حیرتِ واقعہ خاموش
(یعنی اپنی بیقدری سے حیران ہیں) مشعل
بکف گرفتگانند (یعنی فریادیانند) چوں
آذر از دودِ دلِ سیہ پوش ...... نگویم
دُود و چراغست با لالہ و داغ، امّا
سوختگی را سرگزشت ست و خستگی را
رویداد۔ نگویم تجلّی و طور است، یا جنّت و
حور، امّا نازش را قلمرو ست و
آرامش را سواد (لواح)، طلسمِ شعلہ و

ے الفاظ کو اس لیے کہ وہ کاغذ پر مرقوم ہیں،
کاغذی پیرہن کہا ہے اور کاغذی پیرہن داد خواہ کو
کہتے ہیں۔ دوسرے فقرے میں معانی کو اس لیے کہ ان کی
روشنی حروف کی سیاہی میں پوشیدہ ہے مشعل بکف اور سیہ پوش کہا ہے۔

پیر ہنانند تنہا گرد، پختہ مغزانند بر شتہ پوست، بیگانہ نغزانند آشنا دوست، صوفیانند در وحدت خانۂ عشق مست سماع، سوختگانند سپند آسا سرگرمِ وَدَاع، درویشانند تجرد کیش، فرو کیشانند از ہمہ در بیش، شیر صولتانند از جوشنِ خط پلنگینہ پوش، دریا دلانند از شورشِ عشق در جوش و خروش، آیینہ پیکرانند آیینہ تاب، پاکیز گوہرانند یکسر خوشاب، گلبرگہاے شبنم زدۂ بہاریست خراشیدہ ناہاے بلبلِ شاخساریست۔

دُود دست، باز بستۂ زردشت خیال؛ شعلہ پنہاں، و دُود پیدا، دل لوحِ طلسم و زبان طلسم کشا۔ ہنگامۂ ابرد بادست برانگیختۂ جادوے فکر؛ ابر گہر پاش و باد الماس فشاں، اندیشہ طومارِ نیرنگ و لب افسون خوان، دود کبابیست باندازِ پیچ و تابے کہ از شعلہ در دل افتادہ ست، بر ہوا تتق بستہ خیلِ غزالے ست بسامانِ جنبشے کہ در کمین گاہ رُو دادہ است۔ از دام بَدَر جَستہ جمالیست در پردۂ نمایشِ خویش مشاطہ، حقیقی آرایشِ نگار۔ نہالے ست در سایۂ برومندیِ خویش نخلبندِ ازل را سپاس گزار۔

مرزا اور ابو الفضل کی طرزِ بیان کا مقابلہ

مرزا نے مہرِ نیمروز میں اکثر تاریخی واقعات وہی لکھے ہیں، جو شیخ کے اکبر نامہ میں مذکور ہیں؛ مگر چونکہ مرزا نے ان واقعات کو کسی قدر کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ اپنی خاص طرز میں لکھا ہے، اس لیے دونوں کتابوں کی طرزِ بیان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ ہم یہاں ایک سیدھا سادا واقعہ دونوں کتابوں سے نقل کرتے ہیں:

اکبر نامہ

ترک بزرگترینِ فرزندانِ یافث بود.
ترکان او را یافث اوغلان گویند؛
و بہوشیار دلی و کارگزاری و رعیت پروری
از ہمہ برادران امتیاز داشت۔ بعد از
رحلتِ پدر بر تختِ فرمانروائی نشست،
و دادِ مردمی و مردانگی و مظلوم پرستی
داد۔ و در جائے کہ ترکان او را
اسیلول باسلیکائی میگفتند و چشمہ ہائے
آبِ سردِ خوشگوار و گرم عافیت بخش
و مرغزار ہائے دلکش داشت، اقامت
فرمودہ۔ از چوب و گیاہ خانہ ہا اختراع
کردہ، و خرگاہ پدید آورد و از پوستِ
بہائم و سباع لباسِ پوشیدنی دوخت،
و نمک در زمانِ او ظاہر شد۔ و در آیینِ
او آن بود کہ پسر را بجز شمشیرے
میراث ندہند و تمام خواستہ دختر را باشد
و گویند او معاصرِ کیومرث اوّل ملوکِ
عجم ست، و او اوّل سلاطینِ ترکستان
است و عمرِ او دویست و چہل سال بود.
النجہ خان بہترین فرزندانِ ترکی بود۔

مہر نیمروز

ترک ابنِ یافث نشانِ جہاں نداری
یافث و ترکان ایں والا شکوہ را،
ازاں رُو کہ بہ ترکی شہریارِ جواں را
اوغلان گویند، یافث اوغلان گفتند۔
داد و دانش آیین داشت، و دریں
ہر دو شیوہ روشہائے گزیں داشت۔
خانی و مرزبانی را فرہنگ ہا پدید
آورد، و فرماندہی و فرمانبری را اندازہ
برنہاد۔ و نزہتگاہ **سیلول باسلیقا**
را کہ چشمہ ہائے رواں و گل و میوہ فراواں
داشت، از بہرِ آرامش گزید۔ از نے و
علف و چوب و گیاہ نشیمن ہا افراختے،
و پوستِ دام و دد را پوشش تن ساختے۔
گویند نمک بہ روزگارِ وے پدید آمد،
ورنہ ازاں پیش ترہ و گوشت ہمچناں
بے نمک ہمی خوردند۔ ترکانِ شمشیر زن
را بفرمانِ فرزانۂ شیر افگن (یعنی
یافث اوغلان) برنہاد (دستور) و قرار داد
آں بود کہ ازاں ہمہ برگ و ساز کہ از مردہ
مروری (میراث) باز ماند، جز شمشیر بہ پسر

اکبرنامہ

چوں پیمانۂ زندگیِ ترکی
پُرشدن گرفت، او را
بمشورۂ بزرگان بر تختِ
سلطنت نشانده او خردِ
دوربین را پیشوائے
خود ساخت؛ در عدالت
گستری روزگار گذراند.
چوں پیر شد، عزلت
اختیار فرمود. دیباقی
بعد از عزلتِ پدر و
اشارتِ عالیش فرماں روا
شد. کیوک خان،
فرزندِ رشیدِ اوست، پدرش
در ہنگامِ پدرود کردنِ
جہان سریرِ خانی باو
عنایت فرمود. او قدرِ
سلطنت را دانستہ در
لوازمِ آں اہتمام بجا
آورد. النجہ خاں پسرِ
اوست در آخر عمرِ

مہرِ نیمروز

ندہند و ہمہ بدختر باز گزارند کہ ہر آئینہ تیغ جوہر دار فردِ
فہرستِ گنجینۂ سیم و زر بلکہ کلیدِ فتحِ ہفت کشورست.
اگر بدیں پلارکِ الماس گوں دسترس ست، مرد را
دست مایۂ ناز بس ست. بالجملہ ایں ہمہ رسم و آئین
نہاد و پایانِ کار پس از دویست و چہل سالہ بیداری
بخوابِ عدم سر بر زمین نہاد. بزرگانِ دودہ پس از
یافث اوغلان بہ فرزندِ بخت بلندش **ایلنجہ خان**
چشم روشنی گفتند. کلہ کج نہاد و راستی پیشہ گزید. بدی
پیرامونِ دلش نگذشتے، و بابداں ہمزباں نگشتے.
آزادہ رَو بود، و دل بیادِ یزداں در گرو داشت.
تاج و تیغ و نگین در زندگانیِ خویش، بہ نوبادۂ باغِ
کامرانیِ خویش **دیباقی خان** جواں بخت نوجواں سپرد
و خود ازیں خارزار دامن برچید، و بہ آفریں خانہ کہ
تواں را صومعہ گویی، آرمید. دو صد و پنج سال پارۂ بموداریِ اقبال و پارۂ
بپرستاریِ ذوالجلال در جہانِ گذراں ماند، و بہنگامِ
ناگزیر درگذشت. دیباقی خان کہ ہم در نظرگاہِ پدر
اورنگ آرائے بود، اورنگِ خسروی را بر نمطے تازہ
آراست، امّا بدیں دانشوری و دادگری کہ جز دانش
نجُست و جُز داد نکرد. روزنامۂ عمرش چوں رقم
یک صد و ہشتاد و شش سالگی پذیرفت، درنوشتند؛

اکبرنامه

پدر ولیعهد شد۔ داد و
دهش را از اندازه بیرون
برد۔ و ترکان در زبانِ
دولتِ اومستِ دولت
شده از راهِ خردمندی
عدول نمودند و چون
مدتے براں بگذشت،
او را دو پسر به یک شکم
آمد: یکے را مغل نام
کرد و دیگرے را تاتار۔
و چوں بحدِ کاردانی رسیدند
ملکِ خود را به دو
حصه بخش کرد، یک نصف
را به مغل داد و نصفِ
دیگر را به تاتار۔ و چوں پدرِ
بزرگوار ایشاں ودیعتِ
حیات سپرد، فرزندان
با یکدگر موافقت نموده
هرکدام در ولایتِ خویش
خود آرائی میکردند۔

مهر نیمروز

و بارنامهٔ کجکلهی و گردن کشی بنامِ پسرِ فرخ اخترش
کیوک خان نوشتند۔ ستودهٔ ستایش در خورِ بکار
آگاهی آبروے پادشاهی افزود۔ و یک صد و چهل سال
از مرگ اماں یافت۔ فرزانه تا از شاهی نشان یافت،
جهان را بخوشی و خوشنودی و جهانیاں را به مهر و آزرم
نگاهداشت و سرانجام کارِ جهان و جهانیاں را بفرزندِ
خویش النجه خاں گزاشت۔ به تردستی دریا کف، و
به بیدریغ بخشی ابر کردار بود۔ دهش را برداد بیشی داد۔
و فرودستان (زیردستاں) را به دهش از خواهش
بے نیاز ساخت۔ سکراں به باد بُردت (یعنی بکبر و غرور)
از جا رفتند۔ و از دایرهٔ کیش و آئین بدر زدند۔ آرامشِ
(یعنی انتظام) کنار گرفت و بت پرستی صورت پذیرفت۔ بانوے
ایں فرماں رواے بار گرفت و او دو پسر توام زاد۔ اورنگ نشین
(یعنی النجه خان) یکے را **مغل خان** دیگرے را **تاتار خان** نام
نهاد؛ هر دو را بنازه پرورد۔ چوں به برنائی رسیدند، قلمروِ خویش
را دو نیم کرده، نیمه به مغل و نیمه به تاتار نامزد کرد و خود یکصد و بست و هفت
سال در گیتی درنگ ورزیده، پے رفتگاں برداشت۔ الله الله
ایں را نیز چوں روزِ فرودرفتگاں دگر روز فرود رفت ؎

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند
هم خزاں، هم بهار در گزر است

خاتمہ

مرزا غالب مرحوم کی لائف اور ان کے کلام کا انتخاب جس قدر کہ یہاں اس کا دکھانا مقصود تھا، ختم ہو گیا۔ مگر ابھی چند ضروری باتیں لکھنی باقی ہیں۔

ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کتاب ان تصنیفات میں شمار نہیں ہو سکتی، جن کی آج کل ملک میں ضرورت سمجھی جاتی ہے اور جو اہل وطن کی قومی بیماریوں کے لیے براہِ راست دوا اور علاج کا کام دے سکتی ہیں کیوں کہ اس مضمون کے لکھنے پر ہم کو اس اندھی اور بہری دیوی نے مجبور کیا ہے، جس کی زبردستی اور حکومت کے آگے مصلحت اندیشی کے پَر جلتے ہیں۔

مستانہ سخن می رسد از دل بلبِ ما　　　عشق ست کہ بر بستہ زبانِ ادبِ ما

راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق بدوِ شعور سے آج تک برابر چلا آتا ہے، اس کو چاہو، اس معتقدانہ جوشِ عصبیت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے۔ اور چاہو، اس یقین کا ثمرہ خیال کرو، جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ بہر تقدیر یہی وہ چیز تھی جس نے ہم کو اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ پس نہ ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اس تالیف سے پبلک کی کسی بڑی ضرورت کو رفع کیا ہے، اور نہ یہ خیال ہے کہ محض ملک کی خیر خواہی اس کے لکھنے کا باعث ہوئی ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ جو کام محض طبیعت کے اقتضا سے، نہ کہ عقل کی صوابدید سے سر انجام کیا جائے، اس سے لوگوں کو بواسطہ یا بلاواسطہ کسی طرح کچھ فائدہ نہ پہنچے۔ ہوا جو اپنی موج میں چلتی ہے اور دریا جو اپنے جوش میں بہتا

ہے، گو اُن کو خود یہ خبر نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی سعی محض بے حاصل اور ان کی کوشش سراسر بیسود ہے۔ اسی طرح کوئی ذرہ ذرّاتِ عالم میں ایسا نہیں جو اپنی اضطراری حرکت سے نظامِ کلی میں کچھ نہ کچھ دخل نہ رکھتا ہو۔

اے کہ تو ہیچ ذرہ را جز بروِ تو روے نیست　　در طلبت تواں گرفت، بادیہ را بہ رہبری

یادگارِ غالب کو ہم نے دو حصّوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں مرزا کی لائف یعنی ان کی زندگی کے حالات اور اُن کے اخلاق و عادات کا بیان ہے، اور دوسرے حصّے میں ان کے کلام کا انتخاب۔ اگرچہ مرزا کی لائف میں، جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں، کوئی مہتم بالشّان واقعہ ان کی شاعری و انشا پردازی کے سوا نہیں پایا جاتا، بااین ہمہ اس میں بہت سی مفید نصیحتیں بھی اہلِ وطن کے لیے موجود ہیں۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ مرزا پانچ برس کے تھے جب باپ کا اور نو برس کے تھے، جب چچا کا انتقال ہوا۔ ان کی ننھیال جہاں انھوں نے پرورش اور نشوونما پائی آسودہ حال تھی۔ باپ اور چچا کے صغیر سن چھوڑ جانے سے نانا اور نانی کی الفت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہوگی۔ خود مرزا کی طبیعت میں گرمی اور جودت کی ایک آگ بھری تھی جس کے بھڑکانے کے لیے تھوڑی سی اشتعالک کافی تھی۔ باپ اور چچا کا سایۂ تربیت بچپن میں سر سے اٹھ جانا، ننھیال کی مرفہ الحالی، نانا نانی کی ناز برداریاں، اور خود مرزا کا ذکی الحس ہونا، یہ تمام اسباب ایسے تھے کہ عنفوانِ شباب میں ان کا جادۂ مستقیم سے تجاوز نہ کرنا نہایت دشوار تھا۔ مرزا کی ابتدا بگڑی اور ایسی بگڑی کہ جب تک ننھیال کی تمام املاک اور دیہات کی صفائی نہ ہولی، نشّے ہرن نہ ہوئے۔ اگرچہ مرزا بہت دیر

میں سنبھلے، مگر وہ جو مشہور ہے کہ "صبح کا بھولا شام کو آجائے، تو بھولا نہ جانو"
انھوں نے اپنے فضل و کمال، حسنِ معاشرت، شریفانہ خصائل اور کریمانہ اخلاق
سے، جو کہ ان کے ذاتی جوہر تھے، وہ عارضی دھبے اس طرح دھوڈالے کہ گویا
کبھی ان سے دامن آلودہ نہ ہوا تھا۔ جس فن پر انھوں نے لڑکپن میں ہاتھ
ڈالا تھا، اس کو اخیر عمر تک نبھا دیا؛ غفلت اور بدمستی کے عالم میں
بھی اس کا خیال نہ چھوڑا؛ اور باوجودے کہ زمانہ قدر دانوں سے خالی تھا،
اُس کو اُس درجے تک پہنچا کر چھوڑا جو اس کا منتہائے کمال تھا۔

اگرچہ معاش کی طرف سے وہ کبھی زیادہ تنگ نہیں ہوئے مگر حوصلہ
اور ہمت کے موافق کبھی استطاعت نصیب نہیں ہوئی، بلکہ جن اللے تللوں
میں بچپن اور جوانی گزری تھی، اُس کے لحاظ سے یہ کہنا چاہیے کہ وہ
اخیر دم تک خور بعد الکور میں مبتلا رہے۔ اس کے سوا امراضِ جسمانی سے
کبھی فرصت نہیں ملی اور اپنے ہنر کی کساد بازاری کا رنج ہمیشہ سوہانِ
روح رہا۔ باوجود اس کے زندہ دلی اور شگفتہ طبعی مرتے دم تک ان کی
رفیقِ حال رہی۔ اگرچہ نظم و نثر میں جو زارنالیاں انھوں نے کی ہیں، وہ
بظاہر بیصبری اور تنگ حوصلگی پر، جو ایک اخلاقی کمزوری ہے، دلالت
کرتی ہیں، لیکن درحقیقت یہ ان کی شاعری و انشا پردازی کے میدانوں
میں سے ایک میدان تھا، جس کی زمین ان کے پاؤں کو تنگ گئی تھی۔ اوّل
تو خود یہ مضمون ہی ایشیائی شاعری کا جزوِ اعظم ہے؛ دوسرے ہر شاعر
ایک خاص راگنی کا کلاونت ہوتا ہے۔ چنانچہ عرب کے شعرا میں امرا القیس
گھوڑے اور عورت کی تعریف اور عیش کے بیان میں مشہور تھا۔ اعشیٰ
حسنِ طلب اور وصفِ شراب میں ضرب المثل تھا؛ اور اسی طرح ہر شاعر کی

شہرت کسی خاص بیان کے ساتھ مخصوص تھی۔ علیٰ ہذا القیاس، ایران میں فردوسی رزم کا دھنی تھا، نظامی بزم کا، اور سعدی موعظت کا۔ چوں کہ مرزا خاص کر رنج و مصیبت کے بیان میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، اس لیے یہ مضمون اکثر ان کے قلم سے تراوش کرتا تھا۔

اگرچہ مرزا اپنی شاعری کا سکّہ، اس وجہ سے کہ زمانہ اُس کے اندازہ کرنے سے عاجز تھا، پبلک کے دلوں پر جیسا کہ چاہیے تھا، نہیں بٹھا سکے، مگر وسعتِ اخلاق، حسنِ معاشرت، اور صلح کل سے انھوں نے ایک عالم کو مسخّر کر لیا تھا۔ قطع نظر شاگردوں اور مستفیدوں کے، دوستوں اور ہوا خواہوں کی تعداد بھی سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک پہنچ گئی تھی؛ اور ہر ایک کے ساتھ ان کے برتاؤ کا طریقہ ایسا مہر انگیز تھا کہ ہر شخص اپنے تئیں ان کے مخصوص ترین دوستوں میں سے شمار کرتا تھا۔ غریبوں اور محتاجوں کی اپنی دسترس سے بڑھ کر خبر لینی، نوکروں اور لگے بندھوں کو عُسرت کے وقت اپنے سے علیٰحدہ نہ کرنا، درماندگی میں دوستوں کی امداد کرنی، اور ان کی مصیبت پر مثل یگانوں کے افسوس اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنا، ہر حال میں پاسِ وضع اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دینا، مذہبی تعصبات سے پاک ہونا اور ہر مذہب و ملّت کے دوستوں کے ساتھ یکساں صفائی اور خلوص سے ملنا؛ یہ اور اسی قسم کی وہ تمام خوبیاں جو دارالخلافۃ کی قدیم سوسائٹی کا زیور سمجھی جاتی تھیں، اُن کی ذات میں جمع تھیں، خصوصاً وفاداری، حق شناسی، اور احسان مندی کی شریف خصلت جو ہندوستان کے قدیم خاندانوں کا شعار تھا، مرزا کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ چوں کہ ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں لارڈ لیک کی مہمات میں شریک رہے تھے، اور ان کی وفات کے بعد گورنمنٹ

نے ان کے پسماندوں کے لیے، جن میں سے ایک مرزا بھی تھے، کئی ہزار روپیہ سالانہ بطور پنشن کے مقرر کر دیا تھا۔ مرزا نے، جیسا کہ ان کی تحریرات سے ظاہر ہے، اخیرِ عمر تک گورنمنٹ کے اس احسان کو فراموش نہیں کیا؛ بلکہ تمام عمر ملکہ معظمہ اور ویسرائوں اور لفٹنٹ گورنروں اور دیگر حاکموں اور افسروں اور تمام انگلش قوم کی مدح سرائی میں بسر کی؛ بعض افسروں کی وفات پر دردناک مرثیے لکھے، اور ہمیشہ فخر کے ساتھ اپنے تئیں وابستگانِ دامنِ دولتِ انگلشیہ سے سمجھتے رہے۔ غدر کے زمانے میں فوجِ باغی کے ظلم و ستم سے جو اثر ان کے دل پر ہوا تھا، وہ ان کی کتاب دستنبو سے جو غدر کے حالات پر اسی شورش و فتنہ کے زمانے میں انھوں نے لکھی تھی، ظاہر ہے۔ ۱۲۵۲ھ میں ولیم فریزر صاحب رزیڈنٹ و کمشنر دہلی کے بے گناہ مارے جانے پر جو سخت صدمہ ان کو پہنچا تھا، وہ ان کے اس خط سے جو شیخ امام بخش ناسخ کو اس واقعہ کے ہوتے ہی انھوں نے لکھا تھا، ظاہر ہے۔ وہ اس خط میں لکھتے ہیں:

یکے از ستمگرانِ ناخدا ترس کہ بعذابِ ابدی گرفتار باد، ولیم فریزر را کہ رزیڈنٹ دہلی و غالبِ مغلوب را مربی بود، در شبِ تاریک بضربِ تفنگ کشت، و مرا غمِ مرگِ پدر تازہ کرد۔ دل از جائے رفت، و شرگ اندوہے، سراپائے اندیشہ را فرو گرفت۔ خرمنِ آرامیدگی پاک بسوخت و نقشِ امید از صفحۂ ضمیر سراسر ستردہ شد۔

اگرچہ مرزا کے کلام میں مدحیہ قصائد کی مقدار تمام اصنافِ سخن سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور انھوں نے جا بجا اس بات پر افسوس کیا ہے کہ عمر کا بہت بڑا حصہ اہلِ جاہ کی بھٹی میں صرف ہوا، مگر ادنیٰ تامل

سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو فن مرزا نے اختیار کیا تھا، اس کی تکمیل ان کے زمانے کے خیالات کے موافق زیادہ تر اس خاص صنف یعنی قصیدے کی مشق و مہارت پر موقوف تھی کیوں کہ فارسی شاعری کی ابتدا اسی صنف سے ہوئی۔ اور کوئی شاعر جس نے قصیدے میں کمال بہم نہیں پہنچایا، وہ مسلم الثبوت نہیں سمجھا گیا یہاں تک کہ حکیم سنائی، شیخ سعدی اور امیر خسرو جیسے بزرگوں کا دامن بھی اس آلودگی سے پاک نہیں رہا۔ خود مرزا کا قول تھا کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا، اس کو شعرا میں شمار کرنا نہیں چاہیے، اور اسی بنا پر وہ شیخ ابراہیم ذوق کو پورا شاعر اور شاہ نصیر کو ادھورا جانتے تھے۔ بڑی دلیل اس بات کی کہ مرزا نے جس قدر قصیدے اہل دنیا کی مدح میں انشا کیے ہیں، ان سے محض فن کی تکمیل مقصود تھی، یہ ہے کہ ان کا ممدوح مخاطبِ صحیح ہو یا نہ ہو، اور اس سے حسنِ کلام کی داد ملنے کی توقع ہو یا نہ ہو، وہ ہمیشہ قصیدوں کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرتے تھے اور ہر قصیدے میں اپنا کمالِ شاعری اسی طرح ظاہر کرتے تھے، جیسے متنبی، سیف الدولہ کی یا عرفی، خانخاناں کی تعریف میں کرتا تھا۔ مع ذلک چند قصیدوں کے سوا جو دوستوں کی ترغیب و تحریص سے انھوں نے کسی امید یا توقع پر ہندوستان کے بعض رئیس کی مدح میں لکھے ہیں، باقی ان کے تمام قصائد یا توحید و نعت و منقبت میں ہیں، یا اپنے معزز اور لایق ہمعصروں کی تعریف میں، اور یا ان لوگوں کی شان میں جن کو وہ اپنا مربی اور ولی نعمت سمجھتے تھے اور جن کی مدح سرائی کا فرض بطور شکر گزاری و منعم پرستی نہ بامیدِ صلہ و انعام ادا کرتے تھے، جیسے قلعۂ دہلی کے بادشاہ و ولیعہد، یا ملکہ معظمہ اور

ویسرایانِ کشورِ ہند، اور دیگر اعیان و ارکانِ سلطنتِ انگلشیہ یا فرمانروایانِ ریاست رامپور و الور وغیرہ۔

با ایں ہمہ جس موثر طریقے سے مرزا نے اہلِ دنیا کی مدح سرائی پر افسوس کیا ہے وہ ملاحظہ کے قابل ہے۔ وہ دیوانِ فارسی کے دیباچے میں اپنی شاعری کے متعلق بہت سے فخریہ فقرے لکھنے کے بعد لکھتے ہیں:

درہوائے کہ بال بالا خوانی زدہ و درادائے کہ خود را بہ شگرفی ستودہ ام (یعنی جس دیوان پر میں نے اس قدر فخر کیا ہے)، نیمہ ازاں شاہد بازی ست، یعنی ہوا پرستی (اس سے مراد غزل سرائی ہے)، و نیمہ دیگر تونگر ستائی ست، یعنی باد خوانی (اس سے مراد قصیدہ گوئی ہے)۔ بیداد بیں، کہ ہرجا بشانہ خمے از زلفِ مرغول مویاں کشودہ شود بلا در من آویزد، تا دل بہ پیچاکِ آں شکن بندے؛ و خواری نگر کہ ہرگاہ از خود غافل و از خدا فارغ بر اورنگِ سروری کج نشیند، ہوس مرا برانگیزد، تا بہ پیشش بندہ وار ستے ستے۔ شادم از آزادی کہ بہ سخن بہنجارِ عشقبازاں گزاردستم، و داغم از آزمندی کہ ورقے چند بکردارِ دنیا طلباں در مدحِ اہلِ جاہ سیاہ کردستم۔ دریغا کہ عمرِ سبک سیر گذشتہ بہ چامہ و چنگ سرآمد و پارہ بہ دروغ و دریغ رفت۔

یہاں تک جو کچھ کہ مرزا کی لائف کے متعلق ہم کو لکھنا تھا، لکھا گیا۔ اب ہم چند سطریں ان کے کلام کے انتخاب کی نسبت لکھنی چاہتے ہیں۔

ہم نے اس کتاب میں، جیسا کہ مکرر بیان ہو چکا ہے، مرزا کے کلام کا انتخاب صرف اس غرض سے درج کیا ہے کہ شاعری و انشا پردازی کی غیر معمولی استعداد جو مرزا کی فطرت میں رکھی گئی تھی، جہاں تک کہ ان کی نظم و نثر اس پر شہادت دے سکتی ہے، صاحبانِ ذوقِ سلیم پر واضح و لائح ہو جائے۔

اگرچہ فی الحقیقۃ طریقۂ مذکور سے اس غرض کا پورا ہونا نہایت دشوار ہے۔ لیکن بالفرض اس کا پورا ہونا تسلیم کرلیا جائے، تو بھی بظاہر اس سے کوئی فائدہ متصوّر نہیں۔

زمانۂ حال کی ترقیات نے جس طرح علمی دنیا میں انقلابِ عظیم پیدا کردیا ہے، اسی طرح لٹریچر کی حالت بہت کچھ بدل ڈالی ہے۔ قدیم طریقہ کی شاعری (اگرچہ ابھی تک اس کا نعم البدل پیدا نہیں ہوا) روز بروز نظروں سے گرتی جاتی ہے۔ نظم و نثر میں بجائے صنعتِ الفاظ اور محض خیالی باتوں کے سادگی اور حقیقت طرازی کی طرف طبیعتوں کا میلان زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ جو باتیں پہلے محاسنِ کلام میں داخل تھیں، اب ان میں سے اکثر داخلِ عیوب سمجھی جاتی ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں قدیم لٹریچر کا تسلّط ابھی بہت کچھ باقی ہے، اور پبلک کا مذاق عام طور پر نہیں بدلا، مگر زمانے کا رُخ قدیم شاہراہ سے یقیناً پھر گیا ہے اور آیندہ تمام قافلوں کو، جو اس وادی میں قدم رکھنے والے ہیں، زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ضرور ہے۔ پس اگر مرزا کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا شاعر فرض کرلیا جائے، تو بھی اس زمانے میں ان کی نظم و نثر کے نمونے پبلک کے سامنے پیش کرنے اور ان کے مبلغ کمال کو لوگوں سے روشناس کرانا، بظاہر ایک ایسا کام معلوم ہوتا ہے، جس کا وقت گزر گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرجائے، اس کو قدیم نمونوں سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہو سکتا، خصوصاً ہندوستان کی لٹریری ترقی جس قدر مشرقی زبانوں کے قدیم لٹریچر سے وابستہ ہے، ایسی یورپ کی موجودہ لٹریچر سے نہیں ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے بعض نامور شعرا مشرقی

شاعروں کے کلام سے اب تک استفادہ کرتے اور اس سے صدہا اسلوبِ بیان اخذ کرتے ہیں، تو ہمارے ہم وطن کیوں کر اس سے استغنا کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ جس طرح زمانۂ حال کے انجنیر قدیم عمارتوں اور پرانے کھنڈروں سے انجنیرنگ کے متعلق صدہا مفید نتیجے استخراج کرتے ہیں، اسی طرح اس زمانے کے ناظم اور ناثر قدیم لٹریچر سے بہت کچھ لٹریری فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم نے مانا کہ انگلش لٹریچر کی ترقی منتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے، اور ہمارے لٹریچر نے اسی کی بدولت کچھ عرصے سے آگے قدم بڑھانا شروع کیا ہے، مگر جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہم کو انگلش لٹریچر سے کونسی باتیں اخذ کرنی چاہییں اور اپنے قدیم مشرقی لٹریچر سے کیا سبق لینا چاہیے، اس وقت تک ہمارا لٹریچر اصلی ترقی سے محروم رہے گا۔

مرزا کے فارسی کلام کا نمونہ جو ہم نے اس کتاب میں دکھایا ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ وہ زمانۂ حال کے مذاق کے موافق نہ ہو، لیکن اس سے مرزا کے کمالِ شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا۔ خود ایران کے بڑے بڑے نامور شعراء، جو اپنے زمانے میں مسلم الثبوت تھے، آج اہلِ زبان ان کی طرزِ شاعری کو نام رکھتے ہیں، خصوصاً متوسطین کے طبقے میں جو لوگ جامی کے بعد ہوئے ہیں، اور جن میں تقریباً وہ تمام شعرا داخل ہیں، جنھوں نے صفویہ اور مغلیہ کے عہدِ حکومت میں ایران یا ہندوستان میں عَلَمِ امتیاز بلند کیا تھا، ان کی شاعری کو جیسا کہ رضا قلی خان ہدایت نے اپنے تذکرہ مجمع الفصحا میں تصریح کے ساتھ لکھا ہے، آج اہلِ زبان میں کوئی تسلیم نہیں کرتا، سب قدما کی روش کو پسند کرتے ہیں اور انھیں کی تتبع کا دم بھرتے ہیں، حال آنکہ

متوسطین کے طبقے میں بڑے بڑے نامور شعرا گذرے ہیں، جن کے کمال اور استادی کا انکار نہیں ہو سکتا۔ پس درحقیقت کسی کی شاعری یا انشا پردازی کا پبلک کے موجودہ مذاق کے خلاف ہونا، اس کے سوا کچھ معنی نہیں رکھتا کہ جو شے پہلے ایک خاص وضع کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی، وہ اب دوسری وضع کے سانچے میں نہیں سما سکتی

اگرچہ مرزا کی شاعری نے شعرائے متوسطین کے محدود دائرے سے قدم باہر نہیں رکھا؛ وہی چند میدان جن میں انھوں نے اپنے گھوڑے دوڑائے تھے، ہمیشہ مرزا کے جولان گاہ رہے۔ لیکن جس درجے کا ملکۂ شاعری ان کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا، اس سے پایا جاتا ہے کہ جس طرح دریائے مواج جدھر رُخ کرتا ہے، اُدھر اپنا راستہ برابر نکالتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ جس میدان میں قدم رکھتے، اس کو کامیابی کے ساتھ طے کر۔ وہی بارود جو آتش بازی میں بچوں کا جی لبھاتی ہے، جب اس کو دوسری طرح کام میں لایا جاتا ہے، تو بڑے بڑے قلعوں اور پہاڑوں کو پرِ کاہ کی طرح اڑا دیتی ہے۔ اور وہی ایک چیز تھی، جس نے کہیں صرف احباب کے جلسوں اور امیروں کے درباروں کو گرم کیا اور کہیں ملکوں اور قوموں میں حبِ وطن اور قومی ہمدردی کی آگ لگا دی۔

اعلیٰ درجے کا ملکۂ شاعری کسی خاص زمانہ یا خاص ملک کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتا؛ پس یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ شاعری کی اعلیٰ قابلیت جیسی قدما میں ہوتی تھی، ویسی متاخرین میں نہیں ہو سکتی؛ یا جیسی ایران کے شعرا میں ہوتی ہے، ویسی ہندوستان کے شعرا میں نہیں ہوتی۔ ملکۂ شاعری کی مثال بعینہٖ ایسی ہے، جیسی مصوری کی قابلیت یا سریلی آواز۔

جس طرح ان دونوں صفتوں کا ہر زمانے اور ملک میں اعلیٰ سے اعلیٰ
درجے پر پایا جانا ممکن ہے، اسی طرح اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا ملکۂ شاعری
ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف اسباب سے مختلف صورتوں اور مختلف
شانوں میں ظہور کرتا ہے، اور سب سے بڑا اور زبردست حاکم جو شاعر
کو ایک خاص رنگ پر ڈال دیتا ہے، وہ سوسائٹی کا دباؤ اور اس کا
مذاق ہے۔ انیس اسی ملکۂ شاعری کے ساتھ جو اس کی طبیعت میں
پیدا کیا گیا تھا، اگر چوتھی صدی ہجری میں ایران میں پیدا ہوتا، اور
اسی سوسائٹی میں نشوونما پاتا، جس میں فردوسی نے نشوونما پائی تھی،
تو ہمارے نزدیک اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ رزمیہ نظم میں وہی رتبہ
پاتا جو فردوسی نے پایا تھا۔ اور فردوسی اسی اعلیٰ قابلیت کے ساتھ جو
قدرت نے اس کے دماغ میں ودیعت کی تھی، اگر ہندوستان کی اس
سوسائٹی کے سایہ میں پلتا، جو انیس کو میسر آئی تھی تو یقیناً وہ شاعری میں
وہی صنف اختیار کرتا، جو انیس نے اختیار کی تھی اور اس میں انیس سے
کچھ زیادہ قبولیت حاصل نہ کرتا۔ اسی بنا پر ایران کا ایک متاخر شاعر کہتا ہے:

نیست اندر زمانہ محمودے ورنہ ہر گوشہ صد چو عنصر ہیست

اور اسی اصول پر غالب مرحوم کہتے ہیں:

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

مرزا نے جس وقت شعرِ فارسی کے میدان میں قدم رکھا تھا، اس
وقت ہندوستان میں دو طرزوں کا زیادہ رواج تھا: ایک نظیری و
عرفی وغیرہ کی طرز، جو اکبر کے زمانہ سے چلی آتی تھی؛ دوسری مرزا بیدل
کی طرز جو عالمگیر کے عہد میں شائع ہوئی اور علوی و صہبائی پر آکر ختم

ہوگئی۔ جو لوگ شعرِ فارسی میں کمال بہم پہنچانا چاہتے تھے، وہ انھیں دونوں میں سے کوئی طرز اختیار کرتے تھے۔ اگرچہ حافظ اور خسرو کی غزل ان سے بہت زیادہ مقبولِ خاص و عام تھی، مگر ان وجوہات سے جو متاخرین کو طرزِ جدید اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور جن کا ذکر ہم دوسرے حصّے میں کر چکے ہیں، مرزا نے اوّل بیدل کی روش پر چلنا شروع کیا، پھر اس نظر سے کہ اہلِ زبان اس طرز کو ٹکسال سے باہر خیال کرتے تھے، نظیریؔ عرفی کی طرز اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہندی نژاد شاعر جو ایسے ناپرساں زمانے میں پیدا ہوا ہو، اور جس نے فارسی شاعری میں نظیری و عرفی وغیرہ کے کلام سے بہتر کوئی ممکن التقلید نمونہ نہ دیکھا ہو، وہ سوا اس کے کہ ان کا اتباع اختیار کرے، اور کیا کر سکتا تھا۔ رہی یہ بات کہ اس نے اس طرزِ شاعری میں کس قدر کامیابی حاصل کی ہے، اور ان لوگوں کی پیروی کا کہاں تک حق ادا کیا ہے، سو اس کو اس طرح ثابت کرنا تو ناممکن ہے، جیسے دو اور دو چار، البتّہ جو لوگ شعرِ فارسی کا صحیح مذاق رکھتے ہیں، وہ اکبری دَور کے شعرا اور مرزا کے کلام کا مقابلہ کرنے کے بعد، امید ہے کہ، مرزا کی اعلیٰ درجے کی قابلیت و استعداد کا اعتراف کریں گے اور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ زمانہ کا اقتضا اور سوسائٹی کا دباؤ اس شخص کو جس کی روش پر ڈال دیتا، وہ ضرور اس میں کامیاب ہوتا۔ چنانچہ اخیر عمر میں جب حبیب قاآنی کے قصائد مرزا کی نظر سے گزرے، تو اس کے کلام کی روانی اور بے ساختہ پن دیکھ کر ان کو قاآنی کی روش پر چلنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ اسی لیے ان کے سب سے پچھلے قصیدوں اور قطعوں میں بہ نسبت پہلے قصائد اور قطعات کے زیادہ روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے لیکن چونکہ

اب دوسری چال چلنے کا وقت نہیں رہا تھا، اس لیے اس روش کی تکمیل ہونی ناممکن تھی۔

اس کتاب میں، جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے، مرزا کو شاعری کے لحاظ سے جا بجا نظیری و عرفی وغیرہم کا، جن کو مرزا خود اپنا پیش رو تسلیم کرتے ہیں، ہم پلّہ قرار دیا گیا ہے۔ سو قطع نظر اس کے کہ کوئی قطعی دلیل اس دعوے پر قائم نہیں ہو سکتی، اور ناظرین کے ذوق و وجدان کے سوا کوئی چیز اِس کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں دو اور سوال پیدا ہوتے ہیں: اوّل یہ کہ ایک زباندان آدمی شاعری میں اہلِ زبان کے برابر ہو بھی سکتا ہے، یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ ایک پیرو اپنے پیشرووں کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل کر سکتا ہے، یا نہیں؟ سو دوسرے سوال کا جواب تو بالکل صاف ہے۔ دنیا میں ابتدا سے آج تک نہ صرف شعر و شاعری میں، بلکہ ہر علم اور ہر فن اور ہر پیشے میں، اکثر پیرو اپنے پیشرووں کے صرف برابر ہی نہیں، بلکہ ان سے فائق اور افضل ہوتے رہے ہیں۔ فردوسی رزمیہ مثنوی میں اسدی اور دقیقی کا پیرو ہے، مگر دونوں سے گوے سبقت لے گیا ہے۔ خواجہ حافظ غزل میں سعدی کے قدم بہ قدم چلے ہیں، مگر سعدی سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ قاآنی قصیدے میں تمام قدما سے بڑھ گیا ہے۔ میر تقی نے تمام اگلے ریختہ گویوں کو جو یقیناً اس کے پیشرو تھے، غزل میں اپنے سے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ میر انیس تمام مرثیہ گویوں سے جو ان سے پہلے ہوئے، بازی لے گئے ہیں۔ پس اگر مرزا غالب کو فارسی شاعری میں نظیری و عرفی سے افضل نہیں، بلکہ صرف ان کا ہم پلّہ قرار دیا جائے تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے۔

رہا پہلا سوال، سو ظاہر ہے کہ شاعری کا ہنر دو مختلف لیاقتوں سے مرکب ہے۔ ایک امیجنیشن یعنی قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی، دوسرے مناسب الفاظ کے استعمال پر قدرت۔ ان میں سے پہلی لیاقت، جیساکہ ظاہر ہے، ممکن ہے کہ ایک زباندان بہ نسبت اہلِ زبان کے، ایک کم علم بہ نسبت فاضلِ متبحر کے، اور ایک دیہاتی گنوار بہ نسبت خواصِ اہلِ شہر کے، بمراتب افضل اور اعلیٰ درجے کی رکھتا ہو۔ دوسری لیاقت، اگرچہ بظاہر اہلِ زبان کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہے، لیکن اس میں بھی مثلاً ایک ہندی نژاد اکتساب کے ذریعے سے خاص کر اس حصۂ زبان میں جو فارسی کی محدود شاعری میں مستعمل ہے، اہلِ ایران کی برابری کر سکتا ہے۔ علامہ ابن خلدون عربی زبان کی نسبت، جو بمقابلہ فارسی کے نہایت وسیع زبان ہے، لکھتے ہیں کہ "ایک عجمی (یعنی غیر عربی)، فصحائے عرب کے کلام کی ممارست سے اہلِ زبان میں شمار ہو سکتا ہے۔" پس فارسی زبان، جو بہ نسبت عربی کے نہایت تنگ اور مختصر زبان ہے، اس بات کے زیادہ قابل ہے کہ ایک ہندی نژاد فصحائے ایران کے کلام کی مزاولت سے اہلِ زبان میں شمار کیا جائے۔

مذکورۂ بالا اصول کے موافق کچھ شک نہیں کہ ہم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ مرزا کو ملکۂ شاعری کے لحاظ سے اکبری دور کے تمام شاعروں پر ترجیح دیں، یا ان سے کم سمجھیں، یا ان کے برابر قرار دیں۔ رہی دوسری لیاقت، سو اس کی نسبت دوسرے حصے میں جا بجا ذکر کیا گیا ہے کہ مرزا نے ایک نہایت مستند صاحبِ زبان کی تعلیم و تلقین اور اپنے ذاتی تفحص اور کثرتِ مطالعہ اور غواصیِ فکر اور مشقِ سخن اور خاص کر اپنی خداداد لٹریری

قابلیت سے یقیناً وہ مرتبہ حاصل کر لیا تھا، جس سے ایک زباندان مثل اہلِ زبان کے مستند سمجھا جا سکتا ہے۔

لارڈ مکالے نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے پایا جاتا ہے کہ کوئی شخص غیر مادری زبان میں اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں ہو سکتا۔ بے شک ان کا ایسا سمجھنا یورپ کی شاعری کے لحاظ سے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ یورپ کی شاعری درحقیقت نیچر کی ترجمانی ہے، اس کا میدان اسی قدر وسیع ہے، جس قدر نیچر کی فضا۔ اس کے فرائض مادری زبان کے سوا دوسری زبان میں جیسے کہ چاہییں، ادا نہیں ہو سکتے؛ بلکہ ایشیائی شاعر جو اس طریقۂ شاعری سے نابلد ہیں وہ اپنی مادری زبان میں بھی اس کی مشکلات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ بخلاف ایشیائی شاعری اور خاص کر متاخرین کی فارسی شاعری کے کہ یہاں انھیں معمولی خیالات کو جو قدما سیدھے سادے طور پر بیان کر گئے ہیں، نئے نئے اسلوبوں اور نئی نئی نزاکتوں کے ساتھ باندھنا، یہی کمالِ شاعری سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی فی نفسہٖ ایک بہت بڑا کمال ہے، لیکن ایسی شاعری میں زبان کا صرف ایک محدود حصہ مستعمل ہوتا ہے، جس کو غیر زبان والا آسانی سے سیکھ سکتا ہے، اور بشرطیکہ اس میں شاعری کی اعلیٰ قابلیت ہو، اس کو شعرائے اہلِ زبان کی طرح، بلکہ بعض صورتوں میں ان سے بہتر استعمال کر سکتا ہے۔

مرزا کا موازنہ نظیری و عرفی کے ساتھ صرف قصیدے اور غزل میں ہو سکتا ہے کیوں کہ مثنوی میں نظیری محض صفر ہے؛ اس نے اس صنف کو چھوا تک نہیں۔ عرفی نے بے شک چند مثنویاں لکھی ہیں، مگر صاحبِ آتشکدہ نے ان میں سے ایک کی نسبت لکھا ہے کہ "بد نگفتہ است" اور باقی

کی نسبت اس کا یہ قول ہے کہ "بسیار بدگفتہ" حکیم ہمام کا بیٹا حکیم حاذق، عرفی کی مثنوی کی نسبت کہتا ہے:

مثنویش طرزِ فصاحت نداشت — کانِ نمک بود و ملاحت نداشت

البتہ ظہوری کے ساقی نامہ نے ہندوستان میں بہت شہرت حاصل کی ہے۔ مگر اس کا قصیدہ چنداں وزن نہیں رکھتا، بخلاف مرزا کے کہ اس کو مثنوی پر بھی تقریباً اسی قدر قدرت ہے، جیسی قصیدے اور غزل پر۔ نثر میں نظیری و عرفی دونوں نے کوئی یادگار نہیں چھوڑی۔ البتہ ظہوری کی سہ نثر کو ہندوستان میں بہت فروغ ہوا ہے، مگر اس میں اوّل سے آخر تک ایک بے مزہ کہانی یعنی ابراہیم عادل شاہ کی مدح و ستایش کے سوا دوسرے مضمون کا نام نہیں، جس سے لکھنے والے کی قدرتِ بیان معلوم ہو۔ پس اگر ظہوری کی طرزِ بیان اور اور طرزِ عبارت آرائی کے حسن و قبح سے قطع نظر کی جائے، تو بھی اس کے حق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کو مدحیہ نثر لکھنی اچھی آتی تھی، بخلاف مرزا کے کہ وہ اپنی طرزِ خاص میں ہر طرح کے مضامین لکھنے اور ہر طرح کے مقاصد ادا کرنے پر یکساں قدرت رکھتا تھا خصوصاً فخر و خودستائی، غم و اندوہ، اور شکایت و زار نالی کے مضامین جس خوبی و لطافت اور بانکپن کے ساتھ مرزا نے نثر میں بیان کیے ہیں، اس کی نظیر نہ صرف ہندوستانیوں کی نثر میں بلکہ متاخرین اہلِ ایران کی نثر میں مشکل سے دستیاب ہو گی۔ مگر افسوس ہے کہ ہم یہ باتیں ایسے زمانے میں لکھ رہے ہیں کہ گو ہر شخص آزادی سے اپنی رائے ظاہر کر سکتا ہے، لیکن فارسی زبان ہمارے ملک میں بمنزلہ مردہ زبان کے ہو گئی ہے، اور اس لیے لوگوں سے اپنے دعوے کے ثبوت میں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ دیکھو، پڑھو، سمجھو۔

اور جانچو۔

الغرض مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری رائے کا ماحصل یہ ہے کہ ان کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا ؛ مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالا؛ اور نثر میں تینوں سے بالاتر ہے۔ اگرچہ مرزا کی غزل میں کہیں کہیں پیچیدگیاں ہیں، اور نثر میں بھی اکثر فقرے نہایت پیچیدہ نظر آتے ہیں، جو ممکن ہے کہ اہلِ زبان کے نزدیک فصاحت کے درجے سے گرے ہوئے ہوں، مگر ایسی کسروں سے کسی زباندان یا اہلِ زبان کا کلام پاک نہیں ہو سکتا اور نہ ایسی جزوی فروگزاشتوں سے کسی کی استادی میں فرق آ سکتا ہے و للہ درّ القائل :

گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست   در یدِ بیضا ہمہ انگشت ہا یکدست نیست

مرزا کے اُردو کلام کی نسبت ہم دوسرے حصے میں بقدرِ ضرورت بحث کر چکے ہیں۔ مرزا کا موازنہ شعراے اُردو زبان کے ساتھ صرف غزل میں ہو سکتا ہے کیوں کہ غزل کے سوا دیگر اصناف میں ان کا کلام کَانْ لَمْ یَکُنْ ہے۔ اور اُردو کی نثر میں دیگر شعرا بمقابلہ مرزا کے صفرِ محض ہیں۔ مرزا کی غزل کا ڈھنگ اگرچہ میر و سودا کی روش پر نہیں ہے، مگر خواصِ اہلِ ملک جو تقلید کی قید سے آزاد ہیں، ان کے چیدہ و برگزیدہ اشعار کو میر و سودا کے انتخاب سے کچھ کم پسند نہیں کرتے۔

مرزا کی نثرِ اُردو نے تمام ہندوستان میں شہرتِ حاصل کی ہے اور خاص و عام نے بالاتفاق اس کو پسند کیا ہے۔ انھوں نے اُردو خط و کتابت میں ایک خاص طرز کی ایجاد کی ہے جو تمام ملک میں مقبول ہوئی ہے اور اکثر

لوگوں نے اپنی بساط کے موافق اس کی پیروی کی ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد مرزا کی نسبت یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ لٹریری قابلیت کے لحاظ سے مرزا جیسا جامع حیثیات آدمی امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اٹھا۔ اور چوں کہ زمانے کا رُخ بدلا ہوا ہے، اس لیے آیندہ بھی یہ امید نہیں ہے کہ قدیم طرز کی شاعری و انشا پردازی میں ایسے باکمال لوگ اس سرزمین پر پیدا ہوں گے۔

آہنگ
مصنف: اسرار الحق مجاز
صفحات: 240
قیمت:-/84 روپے

عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز وارتقاء
مصنف: محمود الحسن
صفحات: 224
قیمت:-/80 روپے

جدید اردو ادب
مصنف: محمد حسن
صفحات: 256
قیمت:-/87 روپے

رسول اکرم اور یہود حجاز
مصنف: سید برکات احمد
مترجم: مشیر الحق
صفحات: 208
قیمت:-/76 روپے

اقبال کا نظریہ خودی
مصنف: عبدالمغنی
صفحات: 544
قیمت:-/155 روپے

پت جھڑ کی آواز
مصنف: قرۃ العین حیدر
صفحات: 352
قیمت:-/110 روپے

دیوان درد
مصنف: خواجہ میر درد دہلوی
صفحات: 172
قیمت:-/57 روپے

حیات سعدی
مصنف: خواجہ الطاف حسین حالی
صفحات: 256
قیمت:-/72 روپے

ISBN : 978-81-7587-681-1
9 788175 876811

₹ 112/-